الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

تخریب کے لیے جمع ہونا بھیڑ ہے
تعمیر کے لیے جمع ہونا اتحاد ہے

ستمبر ۱۹۸۸

شمارہ ۱۴۲

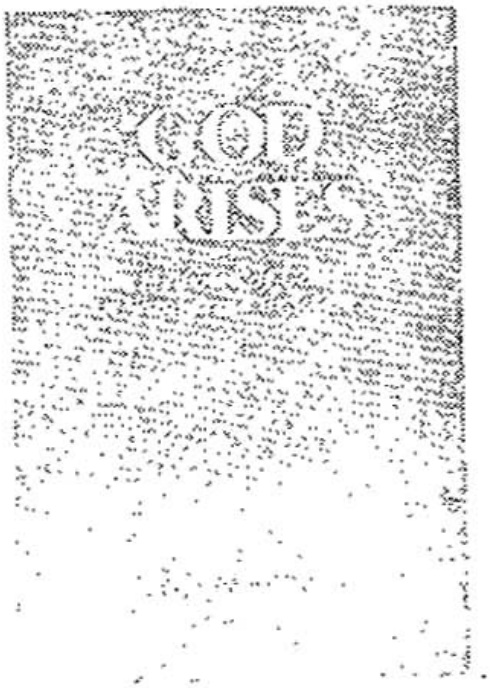

God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is the translation with some additions of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah*, which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, etc., and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

"... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind".

— Daily AL-AHRAM (Cairo)

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk) 81-85063-17-6 (Hbd) Price Rs. 45

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۴۲ ستمبر ۱۹۸۸

فہرست

	صفحہ		صفحہ
اسلامی عبادتیں	۲	غلط فہمی	۱۰
اندھیرے میں اجالا	۳	مشین کی کہانی	۱۱
کامیابی کا راز	۴	اسوۂ رسول	۱۲
اپنی کمزوری	۵	ترکی کا سبق	۱۳
چھوٹا زیادہ بڑا ہے	۶	ایک تاثر	۱۴
دنیا اور آخرت	۷	میدانِ عمل	۱۵
دولت کی سجلی	۸	بربادی کے رہنما	۳۴
کتنا فرق	۹	خبرنامہ اسلامی مرکز	۴۶

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

اسلامی عبادتیں

اسلام کی جو عبادتیں ہیں، ان کی اگرچہ ایک ظاہری شکل ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ان کی ایک اسپرٹ (روح) ہے اور تمام عبادتیں اصلاً اپنی اسی اسپرٹ کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔

نماز کی اسپرٹ تواضع ہے۔ نماز میں اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) کہنا اور پھر سجدہ میں گر کر زمین پر اپنا سر رکھ دینا، اس بات کا اقرار ہے کہ اس دنیا میں ساری بڑائی صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ بندہ کے لیے صحیح رویہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو جھکا دے۔ یہ اقرار آدمی کے اندر تواضع کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ مسجد سے نکل کر جب وہ انسانوں کے درمیان آتا ہے تو ان سے معاملہ کرنے میں اس کا انداز تواضع کا ہوتا ہے نہ کہ غرور اور گھمنڈ کا۔

روزہ کی اسپرٹ برداشت ہے۔ رمضان کے مہینہ میں ناگزیر ضروریات زندگی کے معاملہ میں برداشت کا طریقہ اختیار کرکے آدمی اپنے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ سماج کے اندر تحمل اور برداشت کے ساتھ رہے، جذبات ابھارنے والے مواقع پر وہ بے قابو ہونے سے بچے۔

زکوٰۃ کی اسپرٹ خیر خواہی ہے۔ زکوٰۃ میں آدمی اپنی کمائی کا ایک حصہ دوسروں کو دے کر اپنے اندر یہ جذبہ ابھارتا ہے کہ وہ دوسروں کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھے، دوسروں کی ضرورت کے وقت وہ ان کے کام آئے۔

حج کی اسپرٹ اتحاد ہے۔ حج کے موقع پر ساری دنیا کے مسلمان ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی ناخوش گواریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے متحدہ طور پر عبادتی امور انجام دیتے ہیں۔ یہ اتحاد و اتفاق کا سبق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں۔ وہ مل جل کر رہیں۔ اختلافات میں الجھنے کے بجائے وہ متحد اور متفق ہو کر زندگی گزاریں۔

انسان کا جسم باقی رہے، مگر اس کی روح نکل جائے تو ایسا انسان مردہ انسان ہے۔ اسی طرح جس عبادت کی شکل موجود ہو مگر اس کی روح اس میں نہ پائی جاتی ہو تو ایسی عبادت مُردہ عبادت ہے۔ اس سے وہ فائدہ نہیں مل سکتا جو زندہ عبادت سے عبادت کرنے والے کو ملتا ہے۔

اندھیرے میں اجالا

سید امیر علی (۱۸۴۹ - ۱۹۲۸) کی مشہور انگریزی کتاب ہے جس کا نام روح اسلام (The Spirit of Islam) ہے۔ اس کتاب کے نویں باب میں انھوں نے ایک جرمن مستشرق کا اقتباس ان الفاظ میں نقل کیا ہے :

It was the Koran—"a book by the aid of which the Arabs conquered a world greater than that of Alexander the Great, greater than that of Rome, and in as many tens of years as the latter had wanted hundreds to accomplish her conquests; by the aid of which they alone of all the Shemites came to Europe as kings, whither the Phoenicians had come as tradesmen, and the Jews as fugitives or captives; came to Europe to hold up, together with these fugitives, the light to humanity;—they alone, while darkness lay around, to raise up the wisdom and knowledge of Hellas from the dead, to teach philosophy, medicine, astronomy, and the golden art of song to the West as to the East, to stand at the cradle of modern science, and to cause us late epigoni for ever to weep over the day when Granada fell" (p.394).

قرآن ہی وہ کتاب ہے جس کی مدد سے عربوں نے ایک ایسی دنیا کو فتح کیا جو سکندر اعظم سے بھی زیادہ بڑی تھی، جو روم کی سلطنت سے بھی زیادہ وسیع تھی۔ اور وہ بھی چند دہے میں جس کو پورا کرنے میں موخر الذکر کو کئی سو سال لگ گیے۔ قرآن ہی کی مدد سے ایسا ہوا کہ تمام سامی اقوام میں وہ تنہا لوگ تھے جو یورپ میں حکمراں کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ جہاں فینیقی تاجر کی حیثیت سے آئے تھے، اور یہودی پناہ گیر یا قیدی کی حیثیت سے۔ وہ یورپ آئے تاکہ ان پناہ گیروں کے ساتھ انسانیت کو روشنی دکھائیں۔ جب کہ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ انھوں نے یونان کے علم و حکمت کو دوبارہ زندہ کیا۔ انھوں نے مغرب کو فلسفہ، طب، فلکیات، اور موسیقی کا زرّیں فن سکھایا جیسا کہ انھوں نے مشرق کو سکھایا تھا۔ وہ جدید سائنس کا گہوارہ بن کر کھڑے ہوئے۔ اور انھوں نے ہم بعد میں آنے والوں کو اس کا ماتم کرایا جب کہ غرناطہ ان کے قبضہ سے نکل گیا۔

پچھلے زمانہ کے مسلمانوں کے لیے قرآن ایک تسخیری طاقت ثابت ہوا تھا۔ آج کے مسلمانوں کے لیے قرآن کوئی تسخیری طاقت نہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ آج کے مسلمانوں نے قرآن کی طاقت کو استعمال ہی نہیں کیا۔

کامیابی کا راز

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ جو چیز مجھ کو نہیں مارتی وہ مجھ کو پہلے سے زیادہ طاقتور بنا دیتی ہے:

That which does not kill me makes me stronger.

جب آدمی کسی سخت مشکل سے دوچار ہو اور اس سے دل شکستہ نہ ہو بلکہ غور و فکر کے ذریعہ اس کا حل تلاش کرے تو اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت پیدا کی۔ اس نے اپنے اندر اس صلاحیت کو جگایا کہ وہ ناموافق حالات کا مقابلہ کر سکے۔ وہ رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھتا رہے۔ مشکل نادان آدمی کو برباد کرتی ہے مگر مشکل دانش مند آدمی کے لیے ترقی کا زینہ بن جاتی ہے۔

زندگی میں کامیاب ہونے کے لیے سب سے اہم چیز بلند فکری ہے۔ ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ان سوالات سے اوپر اٹھ جائیں جو ماضی پر یا پیش آنے والے دکھ پر مبنی ہوتے ہیں۔ "ایسا کیوں کر میرے ساتھ پیش آیا۔ اس سوال کے بجائے آدمی کو ایسی باتوں پر سوچنا چاہیے جو مستقبل کے دروازے کھولنے والے ہوں ـــــ اب جب کہ یہ پیش آچکا ہے مجھے اس کے لیے کیا کرنا چاہیے:

"We need to get over the questions that focus on the past and on the pain—'Why did this happen to me?'—and ask instead the question which opens doors to the future. "Now that this has happened, what shall I do about it?'"

Rabbi Harold Kushner, *When Bad Things Happen to Good People*

موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں لازمی طور پر ناخوش گوار واقعات پیش آتے ہیں۔ آدمی بار بار مشکلات میں مبتلا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی حاصل کرنے کا راز صرف ایک ہے۔ وہ ماضی کو بھول کر مستقبل کے بارے میں سوچے۔ وہ کھوئے ہوئے امکانات پر غم نہ کرے بلکہ اپنی ساری توجہ ان امکانات پر لگا دے جو اب بھی اسے حاصل ہیں، جو ابھی تک برباد نہیں ہوئے۔

حال کو ماننا آدمی کے لیے مستقبل کے دروازے کھولتا ہے۔ اور حال کو نہ ماننا آدمی کو حال سے بھی محروم کر دیتا ہے اور آنے والے مستقبل سے بھی۔

اپنی کمزوری

رابرٹ امیان Robert Emmiyan روس کا مشہور کھلاڑی ہے۔ وہ لمبی کود کا چیمپین Top Long-jumper سمجھا جاتا ہے۔ وہ ۱۵ فروری ۱۹۶۵ کو پیدا ہوا اور عالمی مقابلوں میں گولڈ میڈل جیت کر غیر معمولی شہرت حاصل کی۔

ایک ہندستانی جرنلسٹ مسٹر وی کرشنا سوامی نے رابرٹ امیان کا مفصل انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (۵ اپریل ۱۹۸۸) میں شائع ہوا ہے۔ مسٹر کرشنا سوامی نے روسی چیمپین سے پوچھا کہ بین اقوامی کھیل میں جب آپ شرکت کرتے ہیں تو اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے آپ کیا کرتے ہیں۔ رابرٹ امیان نے جواب دیا :

The most important is to get rid of the defects which prevent me from improving my performance. My coach and I know that I have reserves which we must put to use.

سب سے اہم بات اپنی کمزوریوں کو دور کرنا ہے جو کہ میری کارکردگی کو اچھا بنانے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ میرے استاد اور میں دونوں جانتے ہیں کہ میرے اندر محفوظ صلاحیتیں ہیں جن کو ہمیں استعمال میں لانا ہے۔

رابرٹ امیان نے کھیل میں کامیابی کا جو راز بتایا ہے وہی وسیع تر زندگی میں بھی کامیابی کا راز ہے۔ زندگی کے مقابلہ میں جب بھی کوئی شخص ناکام ہوتا ہے تو وہ خود اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ناکام ہوتا ہے۔ اپنی داخلی کمزوریوں کو جاننا اور ان کو دور کرتے ہوئے زیادہ بہتر تیاری کے سا میدانِ عمل میں داخل ہونا، یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔ موجودہ دنیا میں جو شخص کامیاب ہوتا ہے وہ اسی شرط کو پورا کرکے کامیاب ہوتا ہے۔ اور جو شخص ناکام ہوتا ہے وہ اس لیے ناکام ہوتا ہے کہ وہ اس شرط کو پورا کرنے میں کوتاہ ثابت ہوا تھا۔

ناکام وہ ہے جو اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال میں ناکام رہے، اور کامیاب وہ ہے جو اپنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال میں کامیاب ثابت ہو۔

چھوٹا زیادہ بڑا ہے

ہندستان کی آزادی کی تحریک ۱۷۹۹ میں شروع ہوئی جب کہ سلطان ٹیپو انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے مارے گیے۔ اس کے بعد انگریزوں سے لڑنا، انگریز شخصیتوں پر بم مارنا، ان پر حملہ کرنے کے لیے بیرونی حکومتوں کو ابھارنا، جیسے ہنگامے سو سال سے زیادہ مدت تک جاری رہے۔

اس قسم کی تدبیریں اپنی نوعیت میں پر شور تھیں۔ چنانچہ ان کا نام آتے ہی انگریز فوراً چوکنا ہو جاتا تھا اور ان کو پوری طاقت سے کچل دیتا تھا۔ اس کے بعد گاندھی میدانِ سیاست میں آئے تو اچانک صورتِ حال بدل گئی۔ پچھلے لوگ ہنسا کے ذریعہ آزادی کا مطالبہ کرتے تھے، گاندھی نے اس کے برعکس اہنسا کے طریقہ کو اختیار کیا۔ انھوں نے آزادی کی تحریک کو ایسی بنیاد پر چلانے کا اعلان کیا جو انگریزوں کو ناقابل لحاظ دکھائی دے۔

گاندھی کے اسی طریقہ کا ایک جزء وہ ہے جس کو ڈانڈی مارچ کہا جاتا ہے۔ گجرات کے ساحل پر قدیم زمانہ سے نمک بنایا جاتا تھا۔ انگریزی حکومت نے گجرات میں نمک بنانے کی صنعت کو سرکاری قبضہ میں لے لیا۔ گاندھی اس قانون کی پُر امن خلاف ورزی کے لیے سابرمتی سے پیدل روانہ ہوئے اور ۲۴ دن میں ۲۴۰ میل کا سفر طے کر کے ڈانڈی کے ساحل پر پہونچے اور نمک کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ میں لے کر سرکاری قانون کی خلاف ورزی کی۔

گاندھی نے جب اپنے منصوبہ کا اعلان کیا تو انگریز عہدیداروں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس موقع پر ایک انگریز افسر نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان کو اپنا نمک بنانے دو۔ مسٹر گاندھی کو چٹکی بھر نمک سے بہت زیادہ بڑی چیز درکار ہوگی کہ وہ برطانی شہنشاہیت کو زیر کر سکیں:

Let him make his salt. Mr. Gandhi will have to find a great deal more than a pinch of salt to bring down the British Empire.

موجودہ دنیا میں کامیاب اقدام وہ ہے جو دیکھنے میں ناقابل لحاظ دکھائی دے، مگر حقیقۃً وہ ناقابل تسخیر ہو۔ جو حریف کو بظاہر "چٹکی بھر نمک" نظر آئے، مگر انجام کو پہونچے تو وہ "پہاڑ بھر نمک" بن جائے۔

دنیا اور آخرت

ایک دوکاندار نے کہا کہ میں ہر روز اپنی دکان کھولتا ہوں۔ حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ ایک دن دکان کھولنے کی قیمت ایک سو روپیہ ہے۔ ملازم کی تنخواہ بجلی کا بل اور دوسرے مختلف اخراجات۔ پھر میں کیوں دکان کھولتا ہوں اور کیوں ہر روز ایک سو روپیہ کا خرچ برداشت کرتا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ میں ایک سو روپیہ خرچ کرکے ایک ہزار روپیہ کماؤں گا۔ اگر مجھے یہ یقین نہ ہو تو میں کبھی سو روپیہ روز خرچ کرنے کی ہمت نہ کروں۔

یہی زندگی کا اصول ہے۔ آدمی اسی وقت کسی چیز میں اپنی طاقت خرچ کرتا ہے جب کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ میں جتنا خرچ کروں گا اس سے زیادہ میں حاصل کروں گا۔ یہ یقین نہ ہو تو زندگی کی تمام سرگرمیاں ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔

دنیا کے معاملہ میں جس طرح لوگ خرچ کرتے ہیں اسی طرح وہ آخرت کے معاملہ میں خرچ نہیں کرتے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے معاملہ میں نتیجہ فوراً سامنے آجاتا ہے۔ یہاں خرچ کرتے ہوئے آدمی کو یقین رہتا ہے کہ وہ "ایک سو" خرچ کرکے "ایک ہزار" پا سکتا ہے۔ مگر آخرت کے معاملہ میں نتیجہ فوراً سامنے نہیں آتا۔ اس لیے آدمی یقین نہیں کر پاتا کہ وہ جو کچھ خرچ کرے گا وہ اضافہ کے ساتھ اس کی طرف لوٹے گا۔ دنیا کے معاملہ میں خرچ کو وہ پیسہ لگانا (Investment) سمجھتا ہے اور آخرت کے معاملہ میں خرچ کو پیسہ برباد کرنا۔

آخرت کے معاملہ میں خرچ کا "ریٹرن" اگرچہ اپنی پوری شکل میں اگلی دنیا میں ملے گا مگر اس کا ایک حصہ آدمی کو اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔

یہ دنیوی ریٹرن وہ ہے جو آدمی کو نفسیاتی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کو شکر، قناعت اور اعتماد کی دولت ملتی ہے۔ وہ اعلیٰ ربانی احساسات کا تجربہ کرتا ہے۔ وہ بندوں کو دے کر خدا سے پاتا ہے۔ وہ مادی انفاق کرکے روحانی سرمایہ حاصل کرتا ہے۔ وہ کھونے میں پانے کی لذت کا تجربہ کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ اس آخرت کو حسّی طور پر آج ہی کے دن پالیتا ہے جس کو عملی طور پر وہ کل کے دن پائے گا۔

دولت کی بجلی

ایک شخص معمولی حیثیت کا تھا۔ پھر وہ ترقی کر کے دولت مند بن گیا۔ جب وہ معمولی حیثیت کا تھا تو زیادہ خوش رہتا تھا۔ دولت آنے کے بعد وہ پریشان رہنے لگا۔ اس کے ایک پرانے دوست نے پوچھا، یہ تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔ پہلے تم ہنستے بولتے تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ کافی وقت گزارتے تھے۔ اب تم اداس نظر آنے لگے ہو۔ اس نے جواب دیا میرے اوپر دولت کی بجلی گر رہی ہے" دولت نے مجھ کو نئے نئے مسائل میں الجھا دیا ہے۔ پہلے ہمارے بچے ہمارے پاس تھے۔ ہم ان کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آج ہر بچہ ہم سے دور ہے۔ کوئی یورپ، امریکہ پڑھنے گیا ہوا ہے۔ کوئی دور کے کسی مقام پر ملازم ہے۔ جن بچوں کو پہلے ہم میاں بیوی دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ آج ہم ان کے سایہ کے لیے بھی ترستے ہیں۔ بھیڑوں کا فارم ہے تو خیال لگا ہوا ہے کہ اتنی قیمتی بھیڑیں ہیں، پتہ نہیں ان کا کیا ہوا۔ ٹرک چل رہے ہیں تو اس کی فکر ہے کہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہو گیا ہو۔ دکانیں ہیں تو ان کی پریشانی کہ ملازم کہیں گڑبڑ نہ کر رہے ہوں۔ غرض جتنی زیادہ دولت ہے اتنی ہی زیادہ فکر ہے۔ سیل ٹیکس، انکم ٹیکس اور طرح طرح کے قانونی جھگڑے اس کے علاوہ ہیں۔ زندگی لطف سے خالی ہو کر بس مسائل اور پیچیدگیوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔ جو دولت آدمی کو سکون نہ دے بلکہ بے چین کر دے اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ ——— وہ ایک بجلی ہے جو آدمی کے اوپر گر پڑی ہے۔

دولت کو صرف اپنی ذات پر خرچ کیا جائے تو وہ عذاب ہے مگر اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جائے تو وہ نعمت بن جائے گی:

عن ابی ذرؓ قال انتهیتُ الی النبی صلی الله علیه وسلم وهو جالس فی ظلّ الکعبة فلمّا رآنی قال: هم الاخسرون وربّ الکعبة. فقلتُ فداك ابی وامّی من هم. قال هم الاکثرون اموالاً الّا من، قال: هٰکذا وهٰکذا۔ من بین یدیه ومن خلفه وعن یمینه وعن شماله وقلیلٌ ما هم۔ (متفق علیه)

حضرت ابو ذر کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ اس وقت کعبہ کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے جب مجھ کو دیکھا تو فرمایا کہ کعبہ کے رب کی قسم، وہ لوگ گھاٹے میں ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے باپ اور ماں آپ پر فدا ہوں، وہ کون لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ زیادہ مال والے، سوا اس کے جس کو مال ملے تو وہ اپنے آگے اور پیچھے، اپنے دائیں اور بائیں اس کو خرچ کرے۔ اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

کتنا فرق

یکم ستمبر ۱۹۸۳ کو کوریا کی ایر لائنز کا ایک مسافر جہاز (Flight 007) نیویارک سے سیوُل کے لیے روانہ ہوا۔ وہ کمچاٹکا (Kamchatka) کے اوپر اڑ رہا تھا کہ روسی فوج نے اس کو مار کر گرا دیا۔ اس جہاز پر عملہ سمیت ۲۶۹ مسافر تھے جو سب کے سب ہلاک ہوگیے۔ اس کے بعد روسی حکومت نے بیان دیا کہ اس جہاز کو مسافر جہاز سمجھ کر نہیں مارا گیا۔ روسی فوج نے اس کو امریکہ کا (RC-135 spy plane) (جاسوسی جہاز) سمجھا اور مدافعت میں اس پر وار کیا۔ تاہم امریکہ نے اس عذر کو قبول نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ مذکورہ جاسوسی جہاز اور مسافر جہاز (Boeing 747) میں اتنا زیادہ فرق تھا کہ راڈر اسکرین کا مشاہدہ اس کو سمجھنے میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔

۳ جولائی ۱۹۸۸ کو اسی قسم کا ایک اور واقعہ برعکس صورت میں پیش آیا۔ ایران ایر کا ایک مسافر بردار جہاز (Airbus A-300) تہران سے دوبئی جا رہا تھا۔ وہ خلیج فارس کے اوپر اڑ رہا تھا کہ امریکی بحریہ کے جنگی جہاز ونسینز (USS Vincennes) نے اس کو مار کر گرا دیا۔ عملہ سمیت اس کے ۲۹۰ مسافر ہلاک ہوگیے۔ امریکہ کی طرف سے دوبارہ اس کی توجیہہ یہ کی گئی کہ امریکی بحریہ نے غلط فہمی میں ایسا کیا۔ اس نے اس جہاز کو مسافر بردار نہیں سمجھا بلکہ اس کو جنگی جہاز (F-14 jet fighter) سمجھا اور بچاؤ کے طور پر اس کو اپنے میزائل کا نشانہ بنایا۔

امریکہ کے مخالفین کے لیے یہ توجیہہ قابل قبول نہ ہو سکی۔ انھوں نے کہا کہ ایربس کے مقابلہ میں مذکورہ جیٹ فائٹر بہت چھوٹا ہوتا ہے، جب کہ جیٹ فائٹر کی رفتار ایربس کے مقابلہ میں تقریباً ۲۵۰ کیلومیٹر زیادہ ہوتی ہے۔ امریکہ کے بحری جہاز کے راڈر اسکرین پر یہ فرق واضح طور پر دکھائی دے رہا ہوگا۔ اس لیے دونوں میں اشتباہ پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۵ جولائی ۱۹۸۸، صفحہ ۱۲، ہندستان ٹائمس، ۵ جولائی ۱۹۸۸، صفحہ ۱۳)

آدمی دوسرے کی غلطی کو جاننے کے لیے انتہائی ہوشیار ہے، مگر اپنی غلطی کو جاننے کے لیے وہ انتہائی بے وقوف بن جاتا ہے۔ یہی دہرا معیار خرابیوں کی جڑ ہے۔ اگر لوگ ایک معیار والے ہو جائیں تو تمام خرابیاں اپنے آپ ختم ہو جائیں۔

غلط فہمی

بعض اخبارات ہر روز کوئی خاص قول نقل کرتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک ٹائمس آف انڈیا بھی ہے جو روزانہ اپنے اڈیٹوریل کے اوپر کوئی نہ کوئی قول درج کرتا ہے۔ اخبار مذکور کی اشاعت ۱۶ جولائی ۱۹۸۸ کو میں نے کھولا تو اس میں حسب ذیل فقرہ چھپا ہوا تھا :

Beware of novel affairs, for surely
all innovation is error (Muhammad)

یہ ایک حدیث رسول کا انگریزی ترجمہ ہے۔ مگر اپنی موجودہ شکل میں وہ ناقص ہے اور سخت غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس انگریزی فقرہ کا اردو ترجمہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا : نئی باتوں سے بچو، کیوں کہ ہر جدت یقیناً غلطی ہے۔ کوئی شخص صرف اس ترجمہ کو پڑھے تو وہ سمجھے گا کہ پیغمبر اسلام نئی چیز یا نئی ایجاد کے مخالف تھے۔ حالاں کہ مذکورہ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔

یہ ایک لمبی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے جو احمد، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ امورِ دین میں تم لوگ میری سنت پر اور خلفاء راشدین کی سنت پر قائم رہنا، اس سے کسی حال میں نہ ہٹنا۔ یہ نصیحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :

وَاِیَّاکُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ کُلَّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَکُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ

اور تم نئی بات نکالنے سے بچو، کیوں کہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا کا فقرہ اسی حدیث کا انگریزی ترجمہ ہے۔ مگر اس حدیث میں جس بدعت سے روکا گیا ہے وہ دین میں نئی بات نکالنا ہے نہ کہ عام ضرورت کی چیزوں میں نئی بات نکالنا۔ مثلاً کوئی شخص اذان کے بدلے نقارہ بجائے تو یہ بدعت ہے۔ لیکن اذان کی آواز کو تیز کرنے کے لیے لاؤڈ اسپیکر استعمال کیا جائے تو وہ بدعت نہیں۔ حج کو قمری مہینہ کے بجائے شمسی مہینہ میں ادا کیا جائے تو یہ بدعت ہے۔ لیکن اگر حج کے سفر کے لیے اونٹ کے بجائے ہوائی جہاز استعمال کیا جائے تو یہ بدعت نہیں۔

مشین کی کہانی

۳ جون ۱۹۸۸ کو ہونے والے واقعات میں سب سے اہم اخباری واقعہ وہ حادثہ تھا جو ایران کی ہوائی کمپنی کے ساتھ پیش آیا۔ ایران ایر (Iran Air) کا ایک مسافر بردار جہاز (Airbus A-300) تہران سے اڑا۔ وہ دبئی جانے کے لیے خلیج فارس کے اوپر سے گزر رہا تھا کہ امریکہ کے جنگی جہاز (USS Vincennes) نے اس کو مار کر گرادیا۔ عملہ سمیت اس کے ۲۹۰ مسافر ہلاک ہوگیے جن میں مرد، عورتیں اور بچے سب شامل تھے۔

یہ بلاشبہ ایک وحشیانہ واقعہ تھا۔ اتنا سنگین وحشیانہ واقعہ کیوں پیش آیا۔ اس کا جواب امریکی بحریہ کے افسروں نے یہ دیا ہے کہ یہ کمپیوٹر کی غلطی (Computer error) تھی۔ ان کے کمپیوٹر نے مسافر بردار جہاز کو جنگی جہاز بتایا، اس لیے انھوں نے اس پر وار کیا۔

امریکی بحریہ کے مذکورہ جہاز پر جدید ترین قسم کے راڈر لگے ہوئے ہیں۔ اس راڈر کے ساتھ کمپیوٹر کا انتہائی جدید نظام نصب کیا گیا ہے جو مصنوعی ذہانت (Artificial intelligence) سے مسلح ہے۔ یہ سسٹم یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ فضا میں اڑنے والے جہاز کا معائنہ کرکے راڈر اسکرین پر لفظوں میں لکھ دے کہ وہ کس قسم کا جہاز ہے، دوست یا دشمن۔

۳ جون کو جب مذکورہ جہاز فضا کی بلندی میں اڑ رہا تھا تو کمپیوٹر نے اس کا معائنہ کرکے راڈر اسکرین پر جہاز کا اصل نام (ایربس اے ۳۰۰) لکھنے کے بجائے جٹ فائٹر (F-14 jet fighter) لکھ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دوست جہاز نہیں ہے بلکہ دشمن کا جنگی جہاز ہے۔ اس کے فوراً بعد جہاز کے افسر (Captain Will Rogers III) نے بٹن دبایا اور دو میزائل نے اڑکر جہاز کو اس کے تمام مسافروں سمیت قبرستان میں پہونچا دیا (ہندستان ٹائمس، ۱۳ جولائی ۱۹۸۸، صفحہ ۱۲)

جدید ملحدین کا یہ کہنا ہے کہ کائنات ایک مشین ہے۔ اگر کائنات صرف ایک مشین ہے تو یہاں مذکورہ قسم کی مشینی غلطیاں کیوں نہیں ہوتیں۔ کیا وجہ ہے کہ اتنی بڑی کائنات بالکل بے خطا انداز میں مسلسل چلی جارہی ہے۔

اُسوۂ رسولؐ

قدیم مکہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کا پیغام دینا شروع کیا تو اہل مکہ کی اکثریت نے آپ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ وہ آپ کے خلاف طعنہ زنی کرتے، آپ کا مذاق اڑاتے اور غلط حجتیں کرتے (فجعلت قریش یھمزونه ویستھزؤن به ویخاصمونه، ۳۷۶)

اسی سلسلہ کا ایک واقعہ وہ ہے جو ابولہب کی بیوی (ام جمیل) سے متعلق ہے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ام جمیل نے جب سورہ مسد کو سنا جس میں اس کا اور اس کے شوہر کا ذکر ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی جب کہ آپ بیت اللہ میں تھے۔ ابوبکر صدیق بھی آپ کے پاس تھے۔ اس وقت وہ سخت غصہ میں تھی۔ اس نے کہا کہ میں شاعرہ ہوں اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں یہ شعر پڑھا:

مُذَمَّمًا عَصَيْنَا وَأَمْرَهُ أَبَيْنَا وَدِينَهُ قَلَيْنَا

ایک قابل مذمت شخص کی ہم نے نافرمانی کی۔ اس کی بات کا انکار کیا اور اس کے دین سے نفرت کی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مذمم رکھا تھا۔ اس طرح وہ آپ کے خلاف سب وشتم کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ باتیں سن کر فرماتے:

أَلَا تَعْجَبُونَ لِمَا صَرَفَ اللهُ عَنِّي مِنْ أَذَى قُرَيْشٍ يَسُبُّونَ وَيَهْجُونَ مُذَمَّمًا وَأَنَا مُحَمَّدٌ (سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول صفحہ ۳۸۹)	کیا تم کو اس پر تعجب نہیں ہوتا جو اللہ نے قریش کی اذیت کو مجھ سے پھیر دیا۔ وہ مجھ کو برا کہتے ہیں اور مذمم کہہ کر ہجو کرتے ہیں۔ حالاں کہ میں محمد (تعریف کیا ہوا) ہوں۔

قدیم اہل مکہ آپ کو مذمم کہتے تھے مگر آپ کی نظر آنے والے مستقبل پر تھی جب کہ آپ عالمی سطح پر محمد بننے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اہل مکہ کی باتوں پر غصہ نہیں ہوئے۔ جس شخص کی نظر مستقبل کے امکانات پر ہو وہ حال کی ناخوش گواریوں کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ جس کو خدا سے ملا ہوا ہو وہ بندوں سے چھینے جانے پر برہم نہیں ہوگا۔ جس کی صحت پر آسمان گواہی دے رہا ہو، وہ زمین والوں کی تردید پر کبھی بددل نہیں ہوگا۔

ترکی کا سبق

ترکی کے عصمت انونو (۱۹۷۳ - ۱۸۸۴) ایک فوجی افسر تھے۔ انھوں نے کمال اتاترک کا ساتھ دیا۔ اتاترک کی وفات (۱۰ نومبر ۱۹۳۸) کے بعد وہ ترک حکومت کے صدر مقرر ہوگیے۔

کمال اتاترک کے مشہور چھ اصولوں میں سے ایک اصول سیکولرزم تھا۔ اس کا مطلب ان کے نزدیک محض مذہبی ناطرفداری نہ تھا۔ بلکہ جارحانہ لامذہبیت تھا۔ کمال اتاترک کے پورے دورِ حکومت میں اور پھر عصمت انونو کے دورِ حکومت میں یہی حکومت کی مستقل پالیسی رہی۔ مگر مذہب (اسلام) کے خلاف پوری حکومتی طاقت استعمال کرنے کے باوجود ترکی سے مذہب کا خاتمہ نہ کیا جاسکا۔ وہ بدستور پوری طاقت کے ساتھ زندہ رہا، یہاں تک کہ خود عصمت انونو کو اپنے آخری الکشن کے موقع پر بہت سی مذہبی پابندیوں کو ختم کرنا پڑا، کیوں کہ اس کے بغیر وہ عوامی حمایت کی امید نہیں کرسکتے تھے۔

عصمت انونو جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آخر وقت میں انھوں نے اس معاملہ میں اپنے تجربات کا خلاصہ بیان کیا۔ ان کا یہ تجرباتی تاثر عربی رپورٹ کے مطابق یہ تھا:

انی لا اکاد اُصدق ما اری۔ لقد بذلنا کل ما نستطیع لانتزاع الاسلام من نفوس الاتراك وغرس مبادئ الحضارة الغربیة مکانه۔ فاذا بنا نفاجأ بما لم نکن نتوقعه۔ فقد غرسنا العلمانیة فاثمرت الاسلام۔

(الوعی الاسلامی، کویت، ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ صفحہ ۲۷)

میرے لیے اس کا یقین کرنا مشکل ہے جس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے اپنے بس بھر تمام کوشش کی کہ ترکوں کے دل سے اسلام کو نکال دیں اور اس کی جگہ مغربی تہذیب کو ان کے اندر داخل کریں۔ مگر حیرت انگیز طور پر نتیجہ ہماری توقع کے خلاف نکلا۔ ہم نے سیکولرزم کا پودا لگایا مگر اس سے جو پھل نکلا وہ اسلام تھا۔

اسلام کی جڑیں انسانی فطرت میں گہری جمی ہوئی ہیں۔ جس طرح فطرت کو ختم نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اسلام کو بھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام کے خادموں کو ساری کوشش دعوت کے محاذ پر کرنا چاہیے، اسلام کی حفاظت تو اپنے آپ ہو رہی ہے۔

ایک تاثر

جنّت خدا کے محبوب بندوں کی دنیا ہے اور جہنم خدا کے مبغوض بندوں کی دنیا۔ جنت خدا کے انعام یافتہ لوگوں کی بستی ہے اور جہنم خدا کے سزا یافتہ لوگوں کی بستی۔

جنت ان لوگوں کے لیے ہے جو سچائی کا اعتراف کریں، جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو سچائی کی آواز سنیں اور اس کو نظر انداز کر دیں۔ مگر آج وہ روح کہیں نظر نہیں آتی جس کو اعتراف میں لذت ملے۔ ہر آدمی بے اعترافی کی شاخ پر اپنا آشیانہ بنائے ہوئے ہے۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو ہر قسم کی ظاہری عظمتوں سے اپنے آپ کو اوپر اٹھائیں۔ اور خالص عظمتِ خداوندی میں جینے والے بن جائیں۔ اس کے برعکس جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو غیر خدائی عظمتوں میں جئیں۔ مگر آج کا انسان غیر خدائی عظمتوں میں گم ہے۔ خدائی عظمت میں جینے والا انسان ڈھونڈنے پر بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو آخرت کے لیے متحرک ہوں، اور جہنم ان لوگوں کے لیے جو دنیا کی خاطر حرکت میں آئیں۔ مگر آج لوگوں کا یہ حال ہے کہ صرف دنیا کا مفاد انھیں متحرک کرتا ہے آخرت کا مفاد انھیں متحرک کرنے والا نہیں بنتا۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جن کا یہ حال ہو کہ خدا و رسول کے حکم کا ایک حوالہ انھیں جھکنے پر مجبور کر دے۔ اور جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا و رسول کے حکم پر جھکنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ مگر آج یہ حال ہے کہ انسان کے نزدیک خدا اور رسول کے حکم کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے لیے جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ اس کی شخصی یا قومی خواہشیں ہیں۔

جنّت ان لوگوں کے لیے ہے جو ربانی اخلاقیات میں جئیں۔ جنھیں سچ بولنے میں لذت ملے، جن کی روح حق کی ادائیگی میں تسکین پائے۔ اس کے برعکس جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جو جھوٹ میں لذت پائیں، جو ناانصافی کو اپنی غذا بنائے ہوئے ہوں۔

جہنّم کے دروازہ پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے، اور جنّت کی طرف جانے والا راستہ بالکل سونا پڑا ہوا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ غیر خدائی منظر جو آج خدا کی دنیا میں ہر طرف نظر آتا ہے۔

میدانِ عمل

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ کا پرانا قاری ہوں اور اس کو پابندی کے ساتھ شروع سے آخر تک پڑھتا ہوں۔ مگر مجھے ایک معاملہ میں آپ سے اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ آپ مسلمانوں کو پسپائی کا سبق دیتے ہیں۔ انھوں نے چند "مفکرین اسلام" کا نام لے کر کہا کہ ان کو دیکھئے، وہ ہمیشہ اقدام کی باتیں کرتے ہیں۔ مسلمان پیغمبر اعظم کی امت ہیں، وہ پسپائی کے پیغام کو کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد انھوں نے فخر کے ساتھ فارسی کا مشہور مقولہ دہرایا:

کیش مرداں نہ کہ مذہب گوسفنداں

میں نے کہا کہ میرے اور مذکورہ مفکرین کے درمیان یہ فرق نہیں ہے کہ میں پسپائی کی بات کرتا ہوں، اور وہ لوگ اقدام کی بات کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی اقدام کی بات کرتے ہیں۔ جو فرق ہے وہ اس معاملہ میں ہے کہ اس اقدام کا میدان کیا ہو۔ وہ لوگ جنگ اور ٹکراؤ کے میدان میں اقدام کا نعرہ لگاتے ہیں اور میں دعوت اور تبلیغ کے میدان میں اقدام کی تجویز پیش کرتا ہوں۔ بالفاظ دیگر، دوسرے لوگ شمشیری اقدام کے مبلغ ہیں اور میں نظریاتی اقدام کا مبلغ ہوں۔ میرا اور ان کا فرق میدانِ اقدام کے بارہ میں ہے نہ کہ نفسِ اقدام کے بارہ میں۔

اقدام کسی اندھا دھند کارروائی کا نام نہیں، نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خواہ مخواہ کسی چٹان پر سر پٹک کر اپنی جان دے دے۔ اقدام ایک منصوبہ بند عمل کا نام ہے۔ ایک حقیقی اقدام کے لئے وسیع علم اور زبردست ذہانت درکار ہے۔ اقدام ہمیشہ کسی فریق کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ اس کا اہم ترین اصول یہ ہے کہ پیشگی جائزہ لے کر معلوم کیا جائے کہ حالات کی موافقت کس کے ساتھ ہے۔ ایک صورت یہ ہے آپ فریق ثانی کے موافق میدان میں اس سے مقابلہ کریں:

To contest on another man's ground.

میدان مقابلہ اگر فریق ثانی کے حق میں ہو تو ایسی حالت میں فریق ثانی سے ٹکراؤ چھیڑنا اپنے آپ کو جان بوجھ کر شکست کی طرف لے جانا ہے۔ جب ایسا ہو تو فریق اول کو چاہئے کہ وہ حکیمانہ تدبیر سے مقابلہ کو اس میدان میں لے آئے جہاں وہ فریق ثانی کے مقابلہ میں زیادہ بہتر پوزیشن رکھتا ہو

To bring one's enemy to fight on
the ground of one's own choice.

موجودہ زمانہ میں سید احمد شہید بریلوی سے لے کر اب تک، مسلمانوں نے بے شمار چھوٹی بڑی لڑائیاں لڑی ہیں اور تقریباً ہر بار انھیں یک طرفہ ناکامی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اقدام برائے اقدام کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ وہ فریق ثانی کے اپنے موافق میدان میں اس سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ حالاں کہ عقل اور اسلام دونوں کا تقاضا ہے کہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اس کو خود اپنے موافق میدان میں لایا جائے اور پھر اس سے مقابلہ کیا جائے۔

اس بات کی وضاحت کے لئے یہاں میں ایک مثال دوں گا۔

ہندستان کے مسلم لیڈر عام طور پر اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ ہندستان کی آزادی کے لئے انھوں نے برابر کی قربانیاں دیں۔ مگر جب ہندستان آزاد ہوا تو انھیں اس میں برابر کا حصہ نہیں ملا۔ ان سے ہر جگہ "امتیاز" کا سلوک کیا جاتا ہے۔

میرے نزدیک یہ شکایت بے معنی ہے۔ یہ مسلم لیڈروں کے فکری افلاس کو بتاتا ہے۔ انھوں نے اصل معاملہ کو نہ ماضی میں جانا، اور نہ آج وہ اس کو جانتے ہیں۔

مسلم رہنما اس بات کو نہیں جانتے کہ اصل مسئلہ آزادی کے لئے قربانی دینے کا نہیں تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ جب آزادی آئے گی تو اس کی شکل کیا ہوگی۔ دور جدید میں یہی ہونا تھا کہ آزادی جمہوریت کے روپ میں آئے۔ مگر مسلم رہنماؤں کا ذہن ماضی میں اتنا زیادہ اٹکا ہوا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ آزادی جب آئے گی تو وہ "مغل دور" کی واپسی کے ہم معنی ہوگی۔

اس بات کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک لطیفہ ہے کہ ایک سارس اور ایک لومڑی آپس میں دوست تھے۔ ایک بار دونوں نے طے کیا کہ وہ آپس میں مل کر کھیر پکائیں۔ کچھ سامان سارس لایا اور کچھ سامان لومڑی، اور دونوں نے مل کر کھیر پکائی۔ جب کھیر تیار ہوگئی اور وہ وقت آیا کہ اس کو کھایا جائے تو لومڑی نے ایک ہوشیاری کی۔ کھیر کو رکھنے کے لئے وہ ایک تشت لے آئی۔ کھیر جب تشت میں رکھی گئی تو وہ زیادہ تر لومڑی کے حصہ میں آگئی۔ لومڑی نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ دوسری طرف سارس اپنی لمبی چونچ ادھر ادھر مارتا رہا مگر کھیر کی بہت کم مقدار اس کے حصہ میں آسکی۔ وہ کھیر پکانے میں شریک تھا، مگر وہ کھیر کھانے میں شریک نہ ہو سکا۔

اب سارس نے سوچا کہ لومڑی نے تو مجھ کو بیوقوف بنا دیا۔ اس نے سوچ کر ایک نیا منصوبہ بنایا۔ اس نے لومڑی سے کہا کہ آؤ ہم لوگ پھر ایک مرتبہ مل کر کھیر پکائیں۔ لومڑی راضی ہو گئی۔ دونوں سامان لائے اور کھیر پکا کر تیار کی گئی۔ اب جب کھیر کو برتن میں رکھنے کا مرحلہ آیا تو سارس نے فوراً ایک صراحی پیش کر دی۔ چنانچہ کھیر سب کی سب صراحی کے اندر رکھ دی گئی۔ اب سارس نے اپنی لمبی چونچ صراحی کے اندر ڈال کر کھیر کو کھانا شروع کر دیا اور لومڑی سے کہا کہ تم بھی کھاؤ۔ مگر اس بار معاملہ الٹا ہوا۔ سارس نے خوب سیر ہو کر کھیر کھالی، لومڑی کے حصہ میں کچھ نہ آیا۔

یہ لطیفہ بتاتا ہے کہ اصل مسئلہ مشترکہ کھیر پکانے کا نہیں ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ کھیر تیار ہو کر کس قسم کے برتن میں رکھی جائے گی۔ اگر وہ تشت میں رکھی جانے والی ہو تو وہ لومڑی کے حصہ میں چلی جائے گی اور اگر وہ صراحی میں رکھی جائے تو وہ سارس کو ملے گی، آدمی کی عقل مندی یہ ہے کہ کھیر کو اپنے موافق برتن میں رکھنے کی کوشش کرے۔

یہ فرق کیوں

انیسویں صدی کے نصف اول میں انگریز ایک طرف سیاسی اعتبار سے ہندستان میں غلبہ حاصل کر رہے تھے۔ دوسری طرف عیسائی مشنریاں مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے اپنی ساری طاقت صرف کر رہی تھیں۔ ہمارے علماء ان دونوں خطرات کے مقابلہ کے لئے اٹھے اور اس کے لئے غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔ مگر دونوں محاذوں کا انجام ایک دوسرے سے مختلف رہا۔ سیاسی محاذ پر بے پناہ قربانیوں کے باوجود انھیں مکمل ناکامی ہوئی۔ دوسری طرف مشنری محاذ پر نسبتاً کم تر قربانی کے باوجود انھیں مکمل کامیابی حاصل ہوئی۔

دونوں محاذوں کے اس فرق کی علامت مولانا رحمت اللہ کیرانوی (۱۳۰۸-۱۲۳۲ھ) ہیں۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے زمانہ میں یورپ سے پادری فنڈر (Funder) آیا اور اس نے ہندستان کے مسلمانوں میں نہایت طاقت کے ساتھ مسیحیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس کے مقابلہ کے لئے جو لوگ اٹھے، ان میں ایک ممتاز نام مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا تھا۔ انھوں نے "اظہار الحق" اور دوسری کتابیں لکھیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ڈاکٹر وزیر خاں کی مدد سے فنڈر سے مناظرہ کیا۔ آگرہ کے مشہور مناظرہ (۱۰-۱۱ اپریل ۱۸۵۴) میں انھوں نے پادری فنڈر کو ایسی شکست دی کہ اس

کے بعد وہ ہندستان سے بھاگ کھڑا ہوا اور قسطنطنیہ (ترکی) میں جاکر پناہ لی۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ ۱۸۵۷ میں شاملی کے میدان میں علماء نے انگریزی فوج کا مسلح مقابلہ کیا۔ اس مقابلہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی شریک تھے۔ اس وقت ہمارے علماء کے پاس روایتی قسم کے دستی ہتھیار تھے، اور انگریزی فوج کے پاس جدید قسم کے دور مار ہتھیار۔ اس مقابلہ میں علماء کی جماعت کو، زبردست قربانی کے باوجود، مکمل شکست ہوئی۔ اس کے بعد علماء کی گرفتاریاں شروع ہوئیں اور ان کو پھانسی پر چڑھایا جانے لگا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے ہندستان سے مکہ چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ مہیب جنگلوں اور خطرناک راستوں پر پیدل چلتے ہوئے اور ناقابل بیان تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرتے ہوئے سورت کی بندرگاہ پر پہنچے۔ وہاں سے سمندری جہاز پر سوار ہوکر جدہ چلے گئے اور بقیہ زندگی وہیں مقیم رہے (معارف مئی ۱۹۸۸)

ان دونوں واقعات کو تقابلی طور پر دیکھئے۔ ایک جگہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے مقابلہ میں پادری فنڈر میدان چھوڑ کر بھاگا تھا، دوسری جگہ "پادری فنڈر" کے مقابلہ میں خود مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

اس فرق کی وجہ میدانِ مقابلہ کا فرق ہے۔ آگرہ میں دونوں کے درمیان مقابلہ مناظرہ (فکری اور نظریاتی میدان میں) ہوا تھا۔ فکری اور نظریاتی میدان میں اسلام ممتاز طور پر ہر ایک کے مقابلہ میں فوقیت رکھتا ہے۔ اس لئے فریق ثانی کو مکمل ناکامی ہوئی۔ اس کے برعکس شاملی میں جو مقابلہ ہوا وہ فوج اور ہتھیار کے میدان میں تھا۔ اس میدان میں ہمارے علماء فریق ثانی کے مقابلہ میں فیصلہ کن طور پر پسماندہ تھے۔ ہمارے علماء کے پاس زیادہ تر دستی ہتھیار تھے، جب کہ فریق ثانی دور مار ہتھیاروں سے مسلح تھا، یہی فرق تھا جس کی بنا پر یہاں علماء کو مکمل ناکامی ہوئی۔

میں کہوں گا کہ آپ معاملہ پر زیادہ گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم میدان مقابلہ کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم فریق ثانی کو اس میدان میں لانا چاہتے ہیں جہاں وہ ناموافق پوزیشن میں ہو اور ہم موافق پوزیشن میں۔ ہمارے اور دوسرے لوگوں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اس میدان میں متحرک کرنا چاہتے ہیں جہاں ان کا حریف بھاگے۔ اور دوسرے لوگ مسلمانوں کو وہاں ٹکرانا چاہتے ہیں جہاں بالآخر خود ان کو بھاگنا پڑے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا واقعہ، علامتی طور پر، ہماری پوری جدید تاریخ کی تصویر ہے۔ موجودہ زمانہ میں بار بار یہی ہوا۔ اور اب بھی یہی ہو رہا ہے کہ مسلمان فریق ثانی سے اس کے موافق میدان میں ٹکراؤ کرتے ہیں اور ہر بار شدید ترین شکست سے دوچار ہو رہے ہیں۔

دین کا استحکام

قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت کی تکمیل کر دی اور قیامت تک کے لئے اسلام کو مقبول دین کی حیثیت سے پسند کر لیا (المائدہ ۳) اس اعلان کے ساتھ مزید ارشاد ہوا ہے:

الیومَ یئسَ الذین کفروا مِن دینکم فلا تخشوھم واخشَوْنِ (المائدہ ۳)

آج انکار کرنے والے تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے، پس تم ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو۔

قرآن کی یہ آیت ذی الحجہ ۹ ھ میں اتری۔ اس کے اترنے کے تقریباً ڈھائی مہینے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ اس آیت میں الیوم (آج) کا لفظ بہت بامعنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن دو مذہبی دوروں کے درمیان حد فاصل ہے۔ قرآن کے بعد مذہب کی دنیا میں ایک نیا دور شروع ہوا ہے۔ پہلے اگر "تخشوھم" کا دور تھا، تو اب "اخشونی" کا دور ہے۔ پہلے اگر غلبہ کفر کا دور تھا، تو اب غلبۂ دین کا دور ہے۔ قرآن کی تکمیل نے اب خدا کے دین کو آخری طور پر مستحکم کر دیا ہے۔ اس آیت سے صراحۃً یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اب تشویش اور اندیشہ کی چیز یہ ہے کہ اہل ایمان کے اندر خشیت الٰہی (خدا کا خوف) باقی نہ رہے۔ خارجی دشمنوں کی طاقت خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو، اہل ایمان کے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں کرتی۔

دین کے غلبہ و استحکام سے مراد اس کا سیاسی غلبہ و استحکام نہیں۔ سیاسی غلبہ اس دنیا میں کبھی ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ وہ اگر ایک مقام پر پایا جاتا ہے تو دوسرے مقام پر نہیں پایا جاتا۔ اس لئے یہاں غلبہ سے وہ غلبہ مراد لینا ہوگا جو ہر وقت اور ہر جگہ پوری طرح حاصل رہے۔ جس میں کبھی انقطاع ممکن نہ ہو۔ اس قسم کا جاری اور مستمر غلبہ صرف فکر اور نظریہ سے متعلق ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں غلبہ سے مراد فکری غلبہ ہے۔ یہ قرآن اور دین کامل کی وہ خصوصیت ہے جو اس کو ہر حال میں حاصل رہے گی۔ حتی کہ کسی مقام پر کوئی ایک شخص "قرآن" ہو تو وہ بھی اس سے

خالی نہیں ہوسکتا۔

قرآن کی تکمیل کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حق میں ایسے حالات پیدا کر دئے گئے کہ وہ قیامت تک اپنی اصل حالت میں محفوظ رہے۔ قرآن کے ذریعہ دنیا میں ایسا انقلاب لایا گیا جس کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لئے مذہبی جبر کا ماحول ختم ہوگیا اور آدمی کو آزادانہ طور پر اظہار خیال کا حق حاصل ہوگیا۔ اسی طرح اس انقلاب کے نتیجہ میں علمی ترقیوں کا دروازہ کھلا جس نے دین خداوندی کی صداقت کو خود انسانی علم کے معیار پر مبرہن اور مدلل کر دیا۔ جب یہ سب ہوجائے تو اس کے بعد دین الٰہی کی طاقت بے پناہ ہوجاتی ہے۔ اب خدا کا دین ایک محفوظ اور قائم شدہ دین کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ اور جب خدا کا دین محفوظ اور قائم شدہ دین کی حیثیت حاصل کر لے تو اس کی طاقت اتنی زیادہ ہوجاتی ہے کہ کوئی بھی اس کو زیر نہ کر سکے۔

سید احمد شہید بریلوی

اس سلسلہ میں ایک مثال سید احمد شہید بریلوی اور ان کے ساتھیوں کی ہے۔ انھوں نے انیسویں صدی کے ربع ثانی میں پنجاب کے سکھ حکمراں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف جہاد کیا۔ اس میں انھیں مکمل شکست ہوئی۔ ۶ مئی ۱۹۳۱ کو بالاکوٹ میں سید صاحب اور ان کے اکثر ساتھیوں کو سکھ فوج نے ہلاک کر دیا۔ زبردست جانی اور مالی نقصان کے باوجود اس جنگ کا مطلق کوئی فائدہ مسلمانوں کو نہیں ملا۔ البتہ یہ نقصان ہوا کہ مغل دور میں گرو گوبند سنگھ، گرو ارجن سنگھ اور گرو تیغ بہادر سنگھ کے قتل سے سکھوں میں مسلمانوں کے خلاف جو نفرت پیدا ہوئی تھی اس میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔

سید احمد شہید بریلوی کا اقدام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف ناقابل فہم حد تک غیر دانشمندانہ تھا۔ اس کی سلطنت تبت سے لے کر درہ خیبر تک پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں کی فوجی طاقت میں ناقابل عبور حد تک فرق پایا جا رہا تھا۔ سید صاحب کے پاس غیر تربیت یافتہ مریدین کی ایک بھیڑ تھی جو کہ صرف روایتی ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ دوسری طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج نہ صرف تعداد میں بہت زیادہ تھی، بلکہ وہ زیادہ جدید ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ حتی کہ اس کے پاس توپیں بھی موجود تھیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اس واقعہ سے بے خبر تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ نہایت مدبر حکمراں ہے۔ فرانس کے ایک سیاح وکٹر جاکومان (Victor Jacquemont) نے اس کو چھوٹا

نپولین (Bonaparte in miniature) لکھا ہے۔ اسی طرح دوسرے مورخوں اور سیاحوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تدبر اور حکمرانی کی صلاحیت کا غیر معمولی الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ اس کے اسی تدبر کا نتیجہ تھا کہ اس نے فوج کی تنظیم جدید کی اہمیت کو محسوس کیا۔ ۱۸۲۰ء میں اس نے اپنی فوج کو یورپ کے معیار پر منظم کرنا شروع کیا۔ اس نے یورپ کے ۵۰ فوجی افسروں کو اپنی فوج کی تربیت پر مقرر کیا، ان میں اکثریت ان فوجی افسروں کی تھی جو نپولین بونا پارٹ کی فوج میں کام کر چکے تھے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رنجیت سنگھ کی اس فوج نے ۱۸۳۱ میں سرحدی قبائل کی ایک شورش کو کامیابی کے ساتھ کچل دیا جو ایک جنونی مسلمان سید احمد بریلوی، کے نعرۂ جہاد کے تحت ابھری تھی :

In 1831 it successfully quelled a rising of the Frontier tribesmen roused to a holy war (Jihad) by the Muslim fanatic Sayyed Ahmad (15/507).

سید احمد شہید بریلوی نے سکھوں کے اوپر شمشیری قوت کو استعمال کیا۔ مگر وہ مکمل طور پر ناکام رہے۔ زبردست نقصان اور قربانی کے باوجود وہ ایک فی صد کے درجہ میں بھی کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ دوسری طرف انھیں سکھوں کو اسلام کی دعوتی طاقت مسلسل مسخر کرتی رہی ہے۔

گرو نانک اسلام کی تعلیمات سے اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے توحید اور رسالت محمدی کے عقیدہ کو اپنی مذہبی کتاب (گرو گرنتھ صاحب) میں شامل کیا۔ امرتسر کے سورن مندر کی بنیاد مسلمان بزرگ میاں میر سے رکھوائی گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں کچھ علماء گئے تو اس نے تخت سے اتر کر اپنی لمبی داڑھی سے ان کے جوتے صاف کئے۔ اس کے علاوہ بہت سے سکھ ہیں جنھوں نے باقاعدہ کلمۂ توحید کا اقرار کر کے اسلام قبول کر لیا۔ انھیں میں سے ایک مولانا عبید اللہ سندھی (۱۹۴۴ - ۱۸۷۲) تھے۔ وہ سندھ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بعد کو انھوں نے اسلامی کتابیں پڑھیں اور اسلام سے متاثر ہو کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے۔ وغیرہ۔

حدیبیہ کی مثال

روایات میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے بعد کے دور میں تابعین سے کہا کہ تم لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو، مگر ہم لوگ واقعہ حدیبیہ کو فتح قرار دیتے تھے (عن البراء قال : تعدّون الفتح

فتح مكة ۔ ونحن نعدُّ الفتحَ يومَ الحديبية ، سيرة ابن كثير، المجلد الثالث، صفحہ ۳۲۴)

فتح مکہ (۸ھ) کھلا ہوا فتح کا واقعہ تھا۔ جب کہ حدیبیہ بظاہر شکست اور پسپائی کا واقعہ تھا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب عمرہ کے ارادہ سے مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ مگر قریش نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیا۔ آپ کو اپنے تمام ساتھیوں سمیت عمرہ ادا کئے بغیر راستہ ہی سے واپس آجانا پڑا۔ اس کے باوجود صحابہ کرام کے نزدیک فتح کا اصل واقعہ وہ تھا جو حدیبیہ میں پیش آیا نہ کہ وہ جب کہ مکہ میں فاتحانہ داخلہ ہوا۔

اصحاب رسول کا یہ نقطہ نظر بتاتا ہے کہ پسپائی بھی بہت بڑا اقدام ہے۔ بظاہر ایک شکست کے واقعہ میں فتح کا راز چھپا ہوتا ہے۔ واقعہ کا یہ پہلو بے حد اہم ہے، اور اس بنا پر حدیبیہ کے واقعہ کا نہایت گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جانا چاہئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ یکم ذی قعدہ ۶ھ کی تاریخ تھی اور آپ کا مقصد یہ تھا کہ مکہ پہنچ کر بیت اللہ کا عمرہ کریں۔ قریش پچھلے ۶ سال سے مسلمانوں کے لئے زیارتِ کعبہ کا راستہ بند کئے ہوئے تھے۔ اس مدت میں کوئی مسلمان نہ حج کر سکتا تھا اور نہ عمرہ۔ اس لئے جب انھوں نے سنا کہ ڈیڑھ ہزار مسلمانوں کا قافلہ آرہا ہے کہ وہ مکہ میں داخل ہو کر عمرہ کرے تو وہ سخت غضبناک ہوگئے۔ ذی قعدہ کا مہینہ اگرچہ حرام مہینوں میں سے تھا۔ یہ مہینہ سیکڑوں سال سے کعبہ کی زیارت اور حج کے لئے محترم سمجھا جاتا تھا۔ کسی کو یہ حق نہ تھا کہ باہر سے آنے والے کسی شخص کو زیارت کعبہ سے روکے۔ مگر قریش نے جاہلی عصبیت کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ وہ رسول اللہؐ اور آپ کے اصحاب کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو دن کی مسافت طے کر کے عُسفان کے مقام پر پہنچے۔ یہاں آپ کی ملاقات بُسر بن سفیان الکعبی سے ہوئی جو کہ مکہ کی طرف سے آرہا تھا۔ اس نے بتایا کہ قریش کو آپ کے اس سفر کی خبر ہوگئی ہے۔ وہ مکہ سے نکل کر ذی طوی میں جمع ہو گئے ہیں۔ انھوں نے چیتے کی کھالیں پہن رکھی ہیں (یعنی سخت غضب ناک ہیں) انھوں نے عہد کر رکھا ہے کہ وہ ہرگز آپ کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔ اور انھوں نے خالد بن ولید کو ۲۰۰ گھوڑے سواروں کے ساتھ کراع الغمیم کی طرف روانہ کیا ہے تاکہ آپ سے مڈبھیڑ کریں (سیرت ابن ہشام، الجزء الثالث

صفحہ ۳۵۶)

اب ایک صورت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے اور اپنے لوگوں کو جہاد و قتال کی راہ میں لگا دیتے۔ مگر آپ نے اس کے بالکل برعکس عمل فرمایا۔ آپ نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں کون شخص ہے جو ہم کو خالد کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ سے چلا کر آگے لے جائے (مَنْ رَجُلٌ يَخْرُجُ بِنَا عَلٰى طَرِيقٍ غَيْرِ طَرِيقِهِمُ الَّتِي هُمْ بِهَا، صفحہ ۳۵۷)

عبد اللہ بن ابی بکر کہتے ہیں کہ قبیلہ اسلم کے ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ کام میں کروں گا۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں کے قافلہ کو لے کر روانہ ہوا۔ اس نے اس معروف راستہ کو چھوڑ دیا جس پر خالد بن ولید بڑھے ہوئے آرہے تھے۔ اس کے بجائے وہ ایک اور سمت سے روانہ ہوئے۔ باقاعدہ راستہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ سفر سخت دشواریوں کے ساتھ طے ہوا۔ حتی کہ اس پر مشقت سفر پر بعض مسلمانوں کی زبان سے کلمۂ شکایت نکل گیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا: کہو کہ ہم اللہ سے مغفرت چاہتے ہیں اور اس کی طرف توبہ کرتے ہیں (قولوا نستغفر اللہ ونتوب الیہ، ۳۵۷)

جس موقع پر یہ استغفار اور توبہ کرائی گئی اس کے لحاظ سے دیکھئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ——— جب تم کو اپنے آپ پر مصیبت اٹھا کر ٹکراؤ سے بچنے کا حکم دیا گیا تو تم نے شکایت کا لفظ کیوں اپنی زبان سے نکالا۔ تم کو کامل رضامندی کے ساتھ اس خدائی منصوبہ پر چلنا چاہئے تھا۔ اب جب کہ اس معاملہ میں تم سے بے صبری کا اظہار ہوا ہے تو استغفار اور توبہ کے ذریعہ اس کی تلافی کرو۔

اصل یہ ہے کہ قریش کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر جنگ چھیڑنا چاہتے تھے مگر آپ نے ہر قیمت پر جنگ سے اعراض کیا۔ خالد بن ولید سواروں کا دستہ لے کر آپ کی طرف بڑھے تو آپ نے راستہ بدل دیا۔ خراش بن امیہ کو آپ نے سفیر بنا کر مکہ بھیجا۔ وہاں قریش نے ان کے اونٹ کو مار ڈالا۔ وہ خراش کو بھی قتل کر دینا چاہتے تھے تاہم وہ کسی نہ کسی طرح بھاگ کر واپس آگئے۔ قیام حدیبیہ کے زمانہ میں ایک بار مکہ کے پچاس آدمی رات کے وقت آئے اور صحابہ کے پڑاؤ پر پتھر مارنا اور تیر برسانا

شروع کیا۔ انھوں نے آپ کو عمرہ کے لئے مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ یہ بذات خود یہ معنی رکھتا تھا کہ آپ مشتعل ہو کر آمادۂ جنگ ہو جائیں۔ آخری مرحلہ میں جب معاہدۂ حدیبیہ کی شرطیں مقرر کی جانے لگیں تو انھوں نے یک طرفہ شرائط پر اصرار کیا جو تمام مسلمانوں کے لئے سخت اشتعال انگیز اور ناقابلِ برداشت تھا وغیرہ۔ مگر آپ برابر ٹکراؤ سے اعراض کرتے رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ پہنچ کر رک گئے۔ اس مقام کا موجودہ نام شُمیسی ہے اور مکہ سے تقریباً دس میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہیں پر قریش کے نمائندوں سے گفتگو ہوئی اور وہ صلح طے پائی جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

حدیبیہ کے پورے واقعہ پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان ایک بلا اعلان مقابلہ جاری تھا۔ قریش کی ساری کوشش یہ تھی کہ آپ کو میدان جنگ میں لے آئیں۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے ہر ظلم کو سہتے ہوئے اور ان کی ہر اشتعال انگیزی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ قریش کو صلح کے میدان میں لے آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ردعمل اور جوابی کارروائی کا انداز اختیار فرماتے تو قریش کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا اور مسلمان اور قریش ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یک طرفہ صبر اور اعراض اس بات کی ضمانت بن گیا کہ قریش کا خونی منصوبہ کامیاب نہ ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مصالحانہ منصوبہ کامیاب ہو جائے۔

یہ دراصل وہی تدبیر تھی جس کو جنگ کی اصطلاح میں (Ground of one's own choice) کہا جاتا ہے۔ یعنی حریف کو مقابلہ کے لئے اپنے موافق میدان میں لے آنا۔ اس وقت قریش کے لئے مقابلہ کا موافق میدان جنگ تھا کیوں کہ قریش جنگی طاقت میں واضح طور پر مسلمانوں پر برتری رکھتے تھے۔ دوسری طرف فکری اور نظریاتی میدان میں مسلمانوں کو برتری حاصل تھی۔ قریش کی بت پرستی کے مقابلہ میں اسلام کی توحید ہر اعتبار سے فائق حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری کوشش یہ تھی کہ آپ کے اور قریش کے درمیان مقابلہ کا میدان جنگ نہ بنے بلکہ آپ کا اور قریش کا مقابلہ فکری اور نظریاتی میدان میں منتقل ہو جائے۔

تاہم اس مقصد کو حاصل کرنا آسان کام نہ تھا۔ ایک طرف اس کے لئے ضروری تھا کہ آپ

اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ حتی کہ قریش کی جارحیت کو بھی خاموشی کے ساتھ برداشت کریں۔ اور دوسری چیز یہ کہ قریش کی ہر شرط کو یک طرفہ طور پر منظور کرتے چلے جائیں۔ چنانچہ آپ نے یہی کیا۔ حدیبیہ میں آپ کے اور قریش کے درمیان جو معاہدہ طے پایا اس میں تمام شرطیں یک طرفہ طور پر قریش کے حق میں تھیں۔ اس کے باوجود آپ نے ان تمام شرطوں کو اس لئے منظور کر لیا کہ اس کی رو سے قریش اگلے دس سال کے لئے اس بات کے پابند ہو جاتے تھے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف براہ راست یا بالواسطہ جنگ نہیں کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ کا معاہدۂ صلح کر کے مدینہ کے لئے واپس ہوئے تو راستہ میں سورہ فتح نازل ہوئی جس کی پہلی آیت یہ تھی: انا فتحنا لك فتحا مبينا (ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح دے دی) یعنی فریق ثانی مقابلہ کو اپنے موافق میدان (جنگ) کی طرف لے جانا چاہتا تھا۔ مگر اس معاہدہ کے بعد فریق ثانی کے ساتھ تمہارا مقابلہ اس میدان (دعوت) میں آگیا جو واضح طور پر تمہارے موافق ہے۔

بعد کے حالات نے کامل طور پر اس اندازہ کی تصدیق کر دی۔ حدیبیہ کے ناجنگ معاہدہ کے بعد مسلمانوں اور دیگر قبائل کے درمیان آزادانہ اختلاط شروع ہو گیا۔ توحید کی دعوت بلا روک ٹوک ہر طرف پھیلنے لگی۔ توحید کا پیغام جہاں بھی پہنچا اس نے شرک اور بت پرستی کے ذہن کو ہارنے پر مجبور کر دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ صلح حدیبیہ سے پہلے تقریباً بیس سال میں جتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے اس سے بہت زیادہ لوگ صلح حدیبیہ کے بعد صرف دو سال میں مسلمان ہو گئے۔ اب اسلام کی عددی طاقت اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ قریش کے اندر مقابلہ کا حوصلہ باقی نہ رہا۔ وہی قریش جنھوں نے ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو مکہ میں صرف عمرہ کی غرض سے داخل ہونے پر پابندی لگا دی تھی، ۸ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف فاتحانہ کوچ کیا تو قریش کے سردار نے مکہ میں اعلان کر دیا کہ اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ، کیوں کہ آج ہمارے اندر محمدؐ سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں۔

صلح حدیبیہ، ایک لفظ میں، فریق ثانی سے مقابلہ کو جنگ کے میدان سے نکال کر دعوت کے میدان میں لانا ہے۔ یہ اسلام کی حکمتِ بالغہ کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اور اس مثال کا سب سے اعلیٰ نمونہ وہ ہے جو خود پیغمبر اسلام صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنے عمل سے قائم فرمایا۔

وسیع تر میدان

ظاہری طور پر دیکھنے میں حدیبیہ کا واقعہ میدان مقابلہ سے واپسی کا واقعہ معلوم ہوتا ہے لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو وہ چھوٹے مقابلہ سے ہٹ کر بڑے مقابلہ کی طرف جانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "حدیبیہ" محدود میدان مقابلہ کو چھوڑ کر زیادہ وسیع میدان مقابلہ کی طرف اقدام تھا۔ اس اعتبار سے وہ بلاشبہ تدبیری حکمت (Strategy) کی ایک شاہکار مثال ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بے مشن آدمی نہ تھے۔ بلکہ آپ کا ایک عظیم الشان مشن تھا۔ اور صاحب مشن آدمی کے لئے پسپائی کا کوئی سوال نہیں۔ آپ کا معاملہ یہ تھا کہ آپ لوگوں کو یہ پیغام دیتے تھے کہ وہ شرک کے بجائے توحید کا طریقہ اختیار کریں۔ آپ مخلوق پرستی کے بجائے خالق پرستی، بے اصول زندگی کے بجائے بااصول زندگی، دنیا پسندی کے بجائے آخرت پسندی، مصنوعی طریقوں کے بجائے فطری طریقوں کو اختیار کرنے کے علم بردار تھے۔ آپ کے یہ افکار دنیا کے تمام افکار سے زیادہ طاقتور تھے۔ مگر مسلسل جنگی حالات نے آپ کے افکار کی اس طاقت کو ظاہر ہونے سے روک رکھا تھا۔

اس معاملہ کو ایک عام مثال کے ذریعہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ایک سائنسداں اور ایک نیگرو باکسر کا مقابلہ اگر باکسنگ کے اکھاڑے میں ہو رہا ہو تو وہاں یقینی طور پر باکسر کا پلہ بھاری رہے گا لیکن اگر سائنس داں کسی حکمت سے مقابلہ کے میدان کو بدل دے اور باکسر کو باکسنگ کے اکھاڑے سے نکال کر سائنٹفک بحث کی میز پر لے آئے تو یقینی طور پر صورت حال بدل جائے گی۔ پہلے اگر باکسر کا پلہ بھاری تھا تو اب سائنس داں کی جیت یقینی ہو جائے گی۔

قدیم عرب میں، ہجرت کے بعد یہ صورت حال تھی کہ قریش کی ہٹ دھرمی نے "جنگ" کو مقابلہ کا میدان بنا دیا تھا۔ صلح حدیبیہ کی صورت میں جب دونوں فریقوں کے درمیان دس سال کا نا جنگ معاہدہ (No-war pact) ہوا تو اس کے بعد مقابلہ کا میدان بدل گیا۔ اب میدانِ جنگ کے بجائے میدانِ افکار مقابلہ کا مقام قرار پایا۔ اس دوسرے میدان میں اہل اسلام واضح طور پر اپنے فریق کے مقابلہ میں فائق حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے نئے میدان میں آتے ہی اسلام کی فکری اور نظریاتی فتح کا سیلاب پھٹ پڑا۔ لوگ جوق در جوق مذہب توحید کے دائرے میں داخل ہو گئے ــــ

میز کی سطح پر آتے ہی "باکسر" کے مقابلہ میں "سائنس داں" کی جیت یقینی ہوگئی۔

حدیبیہ کے وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی طرف جارہے تھے تو آپ کے ساتھ ڈیڑھ ہزار سے بھی کم آدمی تھے۔ اس کے دو برس بعد آپ نے دوبارہ مکہ کی طرف سفر کیا تو آپ کے ہمراہ دس ہزار آدمی تھے۔ چنانچہ جب آپ مکہ کے قریب پہنچے اور لوگوں نے آپ کے ساتھ انسانوں کا سیلاب دیکھا تو مکہ کے سرداروں نے مکہ میں اعلان کر دیا کہ گھروں میں بیٹھ جاؤ، کیوں کہ آج ہمارے اندر محمد سے لڑنے کی طاقت نہیں ——— مکہ خون بہائے بغیر فتح ہوگیا اور اسی کے ساتھ ساری عرب قوم بھی۔

یہ مکمل طور پر ایک غیر خونی انقلاب تھا۔ مگر اس غیر خونی انقلاب کو وجود میں لانے کے لئے اس کے قائد کو خود خون ہونا پڑا۔ اس کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ایسی شرائط پر راضی ہوئے جو بظاہر انتہائی طور پر یک طرفہ شرائط تھیں۔ آپ کو آگے جانے کے لئے پیچھے ہٹنا پڑا۔ آپ کو فتح حاصل کرنے کے لئے شکست پر راضی ہونا پڑا۔ حتی کہ آپ کو اپنی حیثیت اصلی (رسول اللہ) کا لفظ کاغذ سے حذف کرنا پڑا تاکہ وہ دوبارہ زیادہ کامل طور پر عالمی نقشہ پر لکھا جائے۔

ضروری شرط

حریف سے اپنے موافق میدان میں مقابلہ کرنا، اس کے اوپر فتح حاصل کرنے کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر ہے۔ یہ تدبیر حریف کے مقابلہ میں کامیابی کو یقینی بنا دیتی ہے۔ مگر اس تدبیر کو استعمال کرنے کی ایک ضروری شرط ہے۔ لوگ چونکہ اس شرط کو پورا نہیں کر پاتے، اس لئے وہ اس کے فائدے سے بھی محروم رہتے ہیں۔

یہ شرط، ایک لفظ میں، اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچانا ہے۔ جب بھی کسی سے مقابلہ پیش آتا ہے تو اس کی طرف سے طرح طرح کی منافقانہ کارروائیاں کی جاتی ہیں۔ اشتعال انگیز الفاظ سے لے کر عملی نقصانات تک ہر قسم کے تلخ تجربات سامنے آتے ہیں۔ اس وقت اگر آدمی بھڑک اٹھے تو وہ وقتی جوش کے ساتھ حریف سے وہاں ٹکرا جائے گا جہاں وہ کھڑا ہوا ہے۔ لیکن اگر وہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہو اور ٹھنڈے ذہن سے سوچ کر مقابلہ کا منصوبہ بنائے تو وہ کوشش کرے گا کہ حریف کو اپنے موافق میدان میں لائے۔ اور جب ایسا ہوگا تو اس کی کامیابی یقینی ہو جائے گی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان جان و مال کی بے پناہ قربانی کے باوجود ہر بار اپنے حریف سے

شکست کھا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حریف کی طرف سے کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہے تو وہ فوراً بھڑک کر اس سے لڑ جاتے ہیں۔ اور یہ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ ردعمل کے تحت کی جانے والی لڑائی کا انجام ہمیشہ شکست ہو، اور ردعمل سے اوپر اٹھ کر کئے جانے والے مقابلہ کا انجام ہمیشہ فتح کی صورت میں نکلے۔

جامد گروہ، توسیعی گروہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذوالقعدہ ۶ھ میں حدیبیہ کا معاہدہ کرکے مدینہ کے لئے واپس ہوئے۔ ابھی آپ راستہ ہی میں تھے کہ یہ آیت اتری: انا فتحنا لك فتحا مبينا (الفتح ۱) یعنی ہم نے تم کو تمہارے مخالفوں کے اوپر کھلی فتح دے دی۔ حدیبیہ کی صلح بظاہر فریق ثانی کی شرطوں پر کی گئی تھی، اس لئے جب یہ آیت اتری تو آپ کے اصحاب نے طرح طرح کے سوالات کئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا:

قال رجل من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم أى رسول الله اوفتح هو قال صلى الله عليه وسلم إى والذى نفس محمد بيده انه لفتح

اصحاب رسول میں سے ایک شخص نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا وہ فتح ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، بے شک وہ فتح ہے۔

(تفسیر ابن کثیر، الجزء الرابع، ۱۸۳)

متعدد صحابہ سے مروی ہے کہ انھوں نے بعد کے لوگوں سے کہا کہ تم لوگ فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو مگر ہم لوگ حدیبیہ کو فتح سمجھتے تھے (صفحہ ۱۸۳) اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیبیہ کے معاہدہ نے اہل اسلام کو توسیعی گروہ کی حیثیت دے دی۔ اور اہل شرک محض جامد گروہ بن کر رہ گئے۔ حدیبیہ کے معاہدہ سے پہلے دونوں گروہوں کے درمیان ٹکراؤ اور مڈبھیڑ کی فضا تھی۔ اب تک دونوں کی ملاقات صرف میدان مقابلہ میں ہوتی تھی، صلح کے بعد میدانِ دعوت میں دونوں کی ملاقات کے مواقع پیدا ہو گئے۔ شرک جہاں تھا وہیں رہا۔ مگر اسلام ایسی پوزیشن میں آگیا جہاں سے وہ لوگوں کے دلوں میں نفوذ کر سکے۔

جب ایسا ہو کہ ایک گروہ جامد گروہ ہو اور دوسرا گروہ توسیعی گروہ کی حیثیت حاصل کرلے

تو اس کے فوراً بعد جو واقعہ ہوگا وہ یہ کہ جامد گروہ گھٹنا شروع ہو جائے گا۔ اور توسیعی گروہ مسلسل بڑھنے لگے گا۔ اور جہاں اس قسم کا عمل شروع ہو جائے وہاں بالآخر جو نتیجہ نکلے گا وہ وہی ہوگا جو عرب میں ہوا ——— شرک کو ماننے والے دھیرے دھیرے اسلام میں داخل ہو گئے۔ چند سال بعد ہی دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جہاں دو متقابل گروہ تھے وہاں اب صرف ایک گروہ باقی رہ گیا ہے۔ اور وہ اہلِ اسلام کا گروہ ہے۔

پہاڑ کے اوپر سے پانی کا ایک چشمہ جاری ہوا۔ وہ آگے کی طرف بڑھتا رہا، یہاں تک کہ اس کے راستہ میں ایک چٹان آگئی۔ اب چشمہ کیا کرے گا۔ وہ فوراً دائیں یا بائیں مڑ کر اپنا راستہ بنالے گا۔ چٹان ایک جامد چیز ہے، وہ جہاں ہے وہیں کھڑی رہتی ہے۔ اب اگر چشمہ صرف اس سے ٹکراتا رہے تو اس کا سفر رک جائے گا، اس کے بعد چشمہ کا معاملہ بھی جمود کا معاملہ بن جائے گا۔ جس طرح چٹان کا معاملہ جمود کا معاملہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چشمہ ٹکراؤ پر قائم رہنے کے بجائے اعراض کی پالیسی اختیار کرتا ہے۔ وہ چٹان کو جمود کی دنیا میں چھوڑ کر اپنے لئے توسیع کی دنیا حاصل کر لیتا ہے۔

یہ فطرت کا سبق ہے۔ اسلام ایک دعوت ہے، وہ ایک پھیلنے والی اور بڑھنے والی حقیقت ہے۔ وہ ایک توسیعی پروگرام ہے۔ اس کے مقابلہ میں غیر اسلام ایک جامد چیز ہے۔ وہ پھیلنے اور آگے بڑھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اب اسلام اور غیر اسلام کے ٹکراؤ کے وقت اگر اسلام یہ کرے کہ وہ وہیں ٹھہر کر مقابلہ شروع کر دے تو وہ بھی اسی طرح جامد بن جائے گا جس طرح غیر اسلام جامد ہے۔ وہ اپنی توسیعی حیثیت کو کھو دے گا جو اس کی اصل حیثیت اور اس کی اصل طاقت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی دعوت میں اعراض (Avoidance) کے اصول کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی میں مسلسل اسی اصول اعراض پر عمل فرمایا ہے۔ مکہ کے ابتدائی ۱۳ سال میں مشرکین کے مسلسل ظلم کے باوجود آپ نے ان سے ٹکراؤ نہیں کیا، یہ یہی اعراض تھا۔ حالات زیادہ سخت ہو گئے تو آپ مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے، یہ بھی اعراض تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر زیارت کعبہ میں رکاوٹ ڈالی گئی تو آپ اصرار کئے بغیر درمیان سے واپس آگئے، یہ بھی اعراض تھا۔ اسی طرح ہر ٹکراؤ کے موقع پر آپ نے آخری امکان کی حد تک اعراض کیا ہے۔ کیوں کہ اعراض نہ کرنا گویا اپنے آپ کو فریق ثانی کی طرح جامد گروہ بنا لینے کے ہم معنی تھا، جب کہ اعراض کر کے آپ

نے اپنے کو توسیعی گروہ کی حیثیت دے دی۔ اور توسیعی گروہ کی حیثیت حاصل کرنے ہی کا دوسرا نام غلبہ اور کامیابی ہے۔

تاریخ کا تجربہ

اسلام دین کامل ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اسلام میں اگر ایک طرف نظری طور پر تمام ضروری باتیں بتا دی گئی ہیں، تو اسی کے ساتھ اسلام کی تاریخ میں ہر قسم کی واضح مثالیں بھی قائم کر دی گئی ہیں تاکہ لوگوں کے لئے اسلامی تعلیمات کا سمجھنا آسان ہو جائے۔

اسی سلسلہ کی ایک مثال وہ ہے جو شمشیر کی طاقت اور دعوت کی طاقت کے فرق سے تعلق رکھتی ہے۔ صلاح الدین ایوبی کی ذات اسلام کی تاریخ میں "شمشیر" کی طاقت کا نشان ہے۔ انھوں نے مغرب کی عیسائی طاقتوں کو حطین (شمالی فلسطین) کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی۔ اور دو سو سالہ صلیبی جنگ کا خاتمہ کیا۔ وہ ۲ اکتوبر ۱۱۸۷ کو دوبارہ یروشلم میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ جو ۸۸ سال سے عیسائیوں کے قبضہ میں پڑا ہوا تھا۔

صلاح الدین ایوبی کا انتقال ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو ہوا۔ اس جنگی ہیرو کے انتقال کے صرف ۲۵ سال بعد تاریخ دوسرا منظر پیش کرتی ہے۔ چنگیز خاں کو یہ جرأت ہوتی ہے کہ ۱۲۱۸ء میں وہ ۲۰ ہزار وحشی قبائل کو لے کر مسلم سلطنت (خوارزم) پر حملہ کر دے۔ چنگیز خاں اگرچہ جلد ہی گھوڑے سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ مگر اس کے جانشین تاتاریوں کی پیش قدمی مسلم دنیا میں بلا روک ٹوک جاری رہی۔ یہاں تک کہ انھوں نے سمرقند سے لے کر بغداد تک پوری مسلم دنیا کو تہس نہس کر ڈالا۔

تاتاریوں کا یہ غلبہ اتنا شدید اور اتنا ہمہ گیر تھا کہ مسلم دنیا میں یہ کہا جانے لگا کہ: اذا قیل لك انّ التتر انهزموا فلا تصدق (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاری شکست کھا گئے تو اس کو نہ ماننا) تاتاریوں کے اس دہشت خیز طوفان کو کس چیز نے ختم کیا، اس کا جواب صرف ایک ہے، اور وہ دعوت ہے۔ پچھلے صلیبی مسئلہ سے اگر مسلم دنیا نے شمشیر کی طاقت کے ذریعہ نجات پائی تھی تو تاتاریوں کے شدید تر مسئلہ سے مسلمانوں نے دعوت کی طاقت کے ذریعہ فتح حاصل کی۔

تاتاریوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے پاس تلوار کی طاقت باقی نہیں رہی تھی، اس لئے زیادہ تر مجبورانہ طور پر نہ کہ شعوری طور پر یہ ہوا کہ انھوں نے تاتاریوں کے درمیان دعوت کا خاموش اور پرامن

کام شروع کر دیا۔ تاتاریوں کے پاس اپنی کوئی طاقت ور تہذیب موجود نہ تھی، اس لئے وہ خود بخود مسلم تہذیب سے متاثر ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ مختلف طریقوں سے انھیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسلام کا پیغام پہنچنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر ایک نئی فکری تبدیلی شروع ہو گئی۔ چنگیز خاں کے جن تاتاری جانشینوں نے ۱۳ویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اسلام کی سیاسی قوت کو تاراج کیا تھا، انھوں نے اسی صدی کے خاتمہ تک اسلام کی فکری قوت سے مفتوح ہو کر بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کر لیا۔

پروفیسر فلپ ہٹی کے الفاظ میں، مسلمانوں کے مذہب نے وہاں کامیابی حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے :۔

The religion of the Moslims had conquered where their arms had failed (p. 488).

یہاں مزید یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صلیبیوں کا حملہ جس پر صلاح الدین ایوبی نے فتح پائی، وہ صرف اپنے مقدس مقام (یروشلم) پر قبضہ کرنے کے لئے تھا، جب کہ تاتاری جن پر دعوت کے ذریعہ فتح حاصل ہوئی، وہ پوری مسلم دنیا کو تاراج کرنے کے لئے اٹھے تھے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے تھے۔

مغل حکمراں بابر اسی چنگیز خاں کی نسل سے تھا۔ وہ ۱۵۲۶ء میں دہلی میں داخل ہوا۔ یہ اسی کی نسل تھی جو ۱۸۵۷ تک موجودہ ہندستان (بھارت) سے بہت زیادہ بڑے ملک پر اسلام کی خادم بنی رہی اسلام کے لئے ان کی خدمات بہت زیادہ ہیں جن کی تفصیل یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں۔

اسی زمانہ میں وہ ترکستانی قبائل اٹھے جن کو سلجوقی ترک یا ترکمان غز (Oguz Turkmen) کہا جاتا ہے۔ اپنے ابتدائی زمانہ میں انھوں نے ایران اور اس کے ملحق علاقوں میں زبردست تباہی پھیلائی۔ ان سے مقابلہ کے لئے مسلمانوں کے پاس تلوار کی طاقت موجود نہ تھی۔ کیوں کہ چنگیز خاں اور اس کی نسل (تاتاری) پہلے ہی اس کو آخری حد تک توڑ چکے تھے۔

مغل تاتاریوں کی طرح، ترکمان غز کے سلسلہ میں دعوت کی خاموش اور پر امن طاقت ہی مسلمانوں کے کام آئی۔ تاریخ اگرچہ اس کی تفصیل نہیں بتاتی کہ ترکمان غز کے قبائل پر دعوتی کام کس طرح

کیا گیا۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ اسلام کی دعوتی طاقت ہی نے آخر کار انھیں مسخر کیا۔ ان کا مسئلہ صرف اس طرح ختم ہوا کہ وہ اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر مسلمانوں کے دینی بھائی بن گئے۔

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے مذکورہ بالا دونوں واقعات کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں لکھتے ہیں :

In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant; spiritual conquests: on two great historical occasions, infidel barbarians have set their feet on the necks of the followers of the Prophet,— the Saljuq Turks in the eleventh and the Mongols in the thirteenth century,— and in each case the conquerors have accepted the religion of the conquered (p.2).

اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی شاندار روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔ دو بڑے تاریخی مواقع پر وحشی کافروں نے اپنے پاؤں محمد کے پیروؤں کی گردن پر رکھ دئے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے اور تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں نے، مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کر لیا۔

اسلام کی تاریخ میں ایک ممتاز نام عثمانی ترکوں کا آتا ہے۔ یہ انھیں ترکان غز کی اولاد تھے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ انھوں نے ترکی میں اس عظیم خلافت کی بنیاد ڈالی جو چھ سو سال تک مسلسل قائم رہی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد وہ صرف ۱۹۲۲ء میں ختم ہو سکی :-

Turkish Osman, who is regarded as the founder of the empire that spanned six centuries and came to an end only in 1922.
Encyclopaedia Britannica, vol. 13, p. 771.

یہی عثمانی ترک تھے جنھوں نے ترکی کی وہ عظیم خلافت قائم کی جس کا صدر مقام قسطنطنیہ تھا۔ یہ خلافت پہلی جنگ عظیم تک پوری طاقت کے ساتھ اسلام کی پاسبانی کرتی رہی۔ یہ مدت چھ سو سال تک پھیلی ہوئی ہے۔

گویا صلاح الدین ایوبی کی شمشیری طاقت صرف ۲۵ سال کے لئے اسلام کی پاسبان بنی تھی، مگر اسلام کی دعوتی طاقت چھ سو سال تک اسلام کی عالمی پاسبانی کرتی رہی۔ یہ واقعہ قیامت تک کے لئے اس بات کی نشانی ہے کہ تلوار کے مقابلہ میں دعوت کی طاقت بے شمار گنا حد تک

زیادہ ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ "تلوار" کی عظمت کے قصیدے پڑھیں اور دعوت کو ناقابل لحاظ سمجھ کر چھوڑ دیں، ان سے زیادہ نادان بلاشبہ اس آسمان کے نیچے اور کوئی نہیں۔

قومی سیاست

اسلام ایک قائم شدہ مذہب اور تاریخی طور پر ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ جب کوئی دین یہ حیثیت حاصل کرلے تو وہ اپنے آپ پھیلنے لگتا ہے۔ چنانچہ دور اوّل کے بعد ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت تک اسلام اپنے آپ پھیلتا رہا ہے۔

اسلام کے پھیلاؤ میں پہلی بار رکاوٹ موجودہ نیشنلزم کے دور میں پیدا ہوئی۔ قدیم زمانہ میں ایک فوج کا دوسری فوج سے ٹکراؤ پیش آتا تھا۔ عام انسانی آبادی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ایک قوم دوسری قوم سے ٹکراتی ہے۔ اس طرح ٹکراؤ سے بننے والی دوری اور منافرت پوری کی پوری قوم میں پھیل جاتی ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے دعوت کے اعتبار سے جو سب سے بڑا جرم کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے دوسری قوموں کی تقلید میں اپنی ملی جدوجہد کے لئے "قومی سیاست" کا انداز اختیار کرلیا۔ اس طرح اسلام کی لمبی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ پوری کی پوری قومیں اسلام سے متنفر ہوگئیں۔

مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ قومی سیاست کا انداز مکمل طور پر چھوڑ دیں، تاکہ قومی سطح پر پیدا ہونے والی ضد اور نفرت کی فضا ختم ہو اور اسلام کی اشاعتِ عام کا دروازہ کھلے۔ قومی سیاست کا ترک ہماری ملی جدوجہد کا پہلا زینہ ہے، اس کے بغیر ملی جدوجہد سکڑ دوں سال میں بھی کسی نتیجہ پر پہنچنے والی نہیں۔

اعلان

یہ تقریر (میدان عمل) آڈیو کیسٹ کی صورت میں بھی تیار ہے۔ شائقین حضرات طلب فرمائیں۔ — منیجر الرسالہ

بربادی کے رہنما

ہفت روزہ نئی دنیا (۲۹ جولائی۔ ۴ اگست ۱۹۸۸) میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بابری مسجد رابطہ کمیٹی کے "اہم قائدین" لکھنؤ کے ایک بزرگ عالم سے ملے۔ قائدین نے ان سے اجودھیا مارچ کے بارہ میں تفصیلی گفتگو کی۔ مطبوعہ رپورٹ کے مطابق، مذکورہ عالم نے واضح طور پر کہا کہ اجودھیا مارچ کوئی فقہی مسئلہ نہیں ہے جس پر کسی فتویٰ کی ضرورت ہو یا اس کی کوئی اہمیت ہو۔ "بابری مسجد رابطہ کمیٹی نے مولانا موصوف سے اس سلسلہ میں ان کی رائے طلب کی تھی۔ لیکن مولانا نے صاف کہہ دیا کہ اس مسئلہ پر کسی فتویٰ کی ضرورت نہیں، یہ ایک غیر فقہی مسئلہ ہے۔" صفحہ ۳

۱۔ فقہ علم شریعت کا نام ہے۔ اور اجودھیا مارچ، ذمہ داروں کے اعلان کے مطابق، یہ ہے کہ مسلمان جلوس بناکر بڑی تعداد میں اجودھیا جائیں اور وہاں بابری مسجد کے اندر جمعہ کی نماز پڑھیں۔ اب یہ ناقابل فہم ہے کہ ایک ایسا مسئلہ جس کا تعلق مسجد اور نماز سے ہو، اس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ فقہی اور شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ اس معاملہ میں شریعت سے رہنمائی لینے کی ضرورت نہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ شریعت جو چودہ سو سال سے استنجا اور طہارت تک کے معاملات میں مسلمانوں کی رہنما بنی ہوئی تھی، اب وہ مسجد اور نماز کے معاملہ میں بھی رہنمائی دینے سے عاجز یا غیر متعلق ہوگئی ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اس معاملہ کو دورِ پریس کی اُس مخلوق کے حوالے کردیں جس کو عام طور پر سیاسی لیڈر (صحیح تر لفظ میں سیاسی تاجر) کہا جاتا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک انتہائی عجیب واقعہ ہے جو مسلمانوں کی لمبی تاریخ میں شاید اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔

۲۔ قائدینِ تحریک کے اعلان کے مطابق، اجودھیا مارچ یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں کے مسلمان سفر کرکے ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو اجودھیا پہونچیں اور وہاں بابری مسجد میں داخل ہوکر نماز جمعہ ادا کریں۔ یہ منصوبہ واضح طور پر اس فرمانِ رسول کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دنیا کی صرف تین مسجدیں ہیں جن کے لیے شدِّ رحال جائز ہے، ان کے سوا کسی اور مسجد کے لیے جائز نہیں۔ حدیث میں جن تین استثنائی مسجدوں کا نام لیا گیا ہے، ان میں اجودھیا کی بابری مسجد یقینی طور پر شامل نہیں ہے، اس لیے اس کے واسطے عبادتی شدِّ رحال بھی جائز نہیں ہوسکتا (ملاحظہ ہو الرسالہ اگست ۱۹۸۸)

معلوم ہوا کہ نماز کی ادائیگی کے لیے دور کے بیرونی مقامات سے کوچ کرکے اجودھیا جانا اور وہاں کی بابری مسجد میں نماز ادا کرنے کی کوشش کرنا صراحۃً حدیثِ رسول سے ٹکراتا ہے۔ اور جب کوئی عمل قرآن اور حدیث سے ٹکرائے تو یہی ٹکراؤ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ ایک شرعی نوعیت کا مسئلہ ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ایسے معاملہ میں شریعت سے رہنمائی حاصل کریں، اور جو قدم اٹھائیں شریعت کی مطابقت میں اٹھائیں۔

۳۔ اجودھیا مارچ کسی خالی جزیرہ کی طرف مارچ نہیں ہے۔ وہ ایسے مقام کی طرف مارچ ہے جہاں پہلے سے ایک طاقت ور فریق موجود ہے۔ اگر یہ مارچ ہوتا ہے تو ایک طرف مسلمان ہوں گے جو جلوس کی صورت میں سفر کرکے وہاں پہونچیں گے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو بابری مسجد پر غاصبانہ قبضہ کرکے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کے لیڈروں نے بار بار اعلان کیا ہے کہ مسلمان مکمل طور پر غیر مسلح حالت میں اجودھیا جائیں گے۔ دوسری طرف قبضہ کرنے والے ہیں جن کا کھلا ہوا اعلان ہے کہ وہ مقررہ تاریخ کو تربیت یافتہ نوجوانوں کے دستے بہت بڑی تعداد میں اجودھیا میں اور اجودھیا کے باہر متعین کردیں گے جو مسلمانوں کو بجبر بابری مسجد تک جانے سے روکیں گے۔ اور اگر مسلمان پھر بھی نہ مانیں تو وہ ان کو کچل کر رکھ دیں گے۔

اس قسم کے غیر مساویانہ مارچ کے لیے کسی شاعر کی شاعری یا کسی خطیب کی خطابت میں تو جواز مل سکتا ہے، مگر قرآن و سنت میں اس کے لیے کوئی جواز نہیں۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اپنے مخالفین سے مقابلہ کے وقت بچاؤ کا اہتمام کرو (النساء ۷۱) اسی طرح قرآن میں حکم ہے کہ ایسی قوت فراہم کرو جو تمہارے دشمنوں کو ہیبت زدہ کردینے والی ہو (الانفال ۶۰) ان احکام کی روشنی میں دیکھئے تو مجوزہ مارچ اپنی موجودہ صورت میں خدائی ہدایات کے بالکل خلاف ہے۔ کیوں کہ وہ ضروری تیاری کے بغیر کیا جانے والا ہے، وہ عملی طور پر نہتی مسلم اقلیت کو ہتھیار بند غیر مسلم اکثریت سے ٹکرانے کے ہم معنی ہے۔

۴۔ مارچ کے ذمہ داروں کو مذکورہ نازک صورت حال کا بخوبی علم ہے۔ تاہم ان کا جواب یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کو اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ امن و نظم کو بحال رکھنا اور عوامی جلوس کو حفاظت مہیا کرنا حکومت اور پولس کی ذمہ داری ہے، اور اس کو اسے انجام دینا چاہیے۔

اجودھیا مارچ کے موقع پر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جس تصادم کا یقینی اندیشہ ہے، اس قسم کے فرقہ وارانہ تصادم ۱۹۴۷ سے اب تک بار بار مختلف شکلوں میں پیش آتے رہے ہیں۔ حتی کہ

ان کی تعداد اب دس ہزار سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ مگر خود انھیں مسلم لیڈروں کے چھپے ہوئے بیانات کے مطابق، ہر ایسے تصادم میں پولس اور انتظامیہ نے ہمیشہ جانبدارانہ معاملہ کیا ہے۔ یعنی وہ غیر مسلم فرقہ کو حفاظت دے کر مسلم فرقہ کے لوگوں کو یک طرفہ طور پر اپنے ظلم کا نشانہ بناتی ہے۔ (مثال کے طور پر میرٹھ اور ملیانہ کا واقعہ، اپریل۔ مئی ۱۹۸۷) ایسی حالت میں مسلم لیڈروں کا مذکورہ جواب اِس حدیثِ رسول سے ٹکرا رہا ہے کہ مومن ایک بِل سے دوبار نہیں ڈسا جاتا (اَلمومنُ لَا یُلدَغ مِن جُحرٍ مَرّتَین) جب ایک خطرناک بِل کا دوبار تجربہ کرنا بھی ایمان کے خلاف ہو تو ایسی ایک معلوم بِل کا دس ہزار بار تجربہ کرنا کیوں کر شریعت کے مطابق ہو سکتا ہے۔

۵۔ اجودھیا مارچ کے موقع پر پولیس اور انتظامیہ کا یہ متوقع کردار محض قیاس نہیں ہے۔ وہ "مرشد آباد مارچ" کی صورت میں انتہائی بھیانک طور پر پیشگی سامنے آچکا ہے۔ بنگال اور بہار کے مسلمان، مقامی مسلم لیڈروں کی رہنمائی میں، تقریباً ۵۰ ہزار کی تعداد میں ۲۴ جون ۱۹۸۸ کو مرشد آباد (مغربی بنگال) پہونچے تاکہ وہاں کی قدیم کٹرہ مسجد میں نماز جمعہ ادا کریں۔ مگر خود مسلم لیڈروں کا بیان ہے کہ وہاں کی پولیس اور انتظامیہ نے جانتے بوجھتے ان نہتے مسلمانوں کو غیر مسلم فرقہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جنھوں نے نہایت بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کو اپنے خونخوار عزائم کا نشانہ بنایا۔ مسلمان کٹرہ مسجد تک پہونچ کر نماز بھی ادا نہ کر سکے۔ ان میں سے کچھ لوگ راستہ ہی میں ہلاک ہو گیے، اور کچھ لوگ لٹ کر اور زخمی ہو کر اپنے گھروں کو ناکام واپس لوٹ آئے۔

جس پولس اور انتظامیہ کے نکمے پن کا یہ تجربہ ہو، اس کی حفاظت کے بھروسہ پر نہتے مسلمانوں کو تشدد پر آمادہ مجمع کے درمیان بھیجنا، شریعت تو درکنار، عقلِ عام (Common sense) کے بھی خلاف ہے۔

بعض ہوشیار لیڈر کہتے ہیں کہ ان مواقع پر اگر کچھ مسلمان مارے جائیں تو اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ اس طرح ہمارا پروٹسٹ تو رجسٹر رہتا ہے۔ میں کہوں گا کہ اگر پروٹسٹ ہی رجسٹر کرنا مقصود ہے تو اس کے لیے عوام کو مروانا بے فائدہ ہے۔ پھر تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ ہمارے بے ریش اور باریش لیڈر نکلیں اور زبردستی خطرہ کے مقامات میں گھس کر لاٹھیاں اور گولیاں کھائیں۔ اگر لیڈروں میں سے کچھ لوگ مریں اور ان کی لاشیں سڑکوں پر نظر آئیں تو ہمارا پروٹسٹ زیادہ جلی خط

(Bold letters) میں رجسٹر ہوگا، عوام کے مرنے کی صورت میں تو وہ صرف خفی خط میں رجسٹر ہو رہا ہے۔

۶ ۔ قرآن (الحج ۶۷) میں حکم دیا گیا ہے کہ فلا ینازعنك فی الامر وادع الی ربك انك لعلی هدی مستقیم (پس وہ تم سے نزاع کی راہ نہ پائیں اور اپنے رب کی طرف بلاتے رہو۔ بے شک تم سیدھے راستہ پر ہو) یہ ایک اہم تعلیم ہے جو قرآن و حدیث میں مختلف انداز سے دی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے مقابلہ میں نزاع اور ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کرو، بلکہ دعوت کا طریقہ اختیار کرو۔ موجودہ مسلم لیڈروں نے مسلم ملت کے مسائل کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس کو اگر سیاسی عمل (Political activism) کہا جائے تو اس سلسلہ میں اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ کو دعوتی عمل (Dawah activism) کہا جا سکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اسی طریق کار کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، آپ کے زمانہ میں سب سے زیادہ محترم مسجد کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ توحید کے اس گھر میں باقاعدہ مشرکانہ عمل کیا جاتا تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کے حل کے لیے "مارچ" کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ بلکہ دعوت کے طریقے پر چل کر اس کو حل کیا۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق نے اسی اسلامی حکمت کا لحاظ کرتے ہوئے فلسطین کے گرجا گھر کے اندر نماز نہیں پڑھی (ملاحظہ ہو الرسالہ مارچ ۱۹۸۶، صفحہ ۲)

بابری مسجد کی مورتی کا معاملہ بھی چھوٹے درجہ میں اسی نوعیت کا ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر چل کر اس کا حل تلاش کرنا چاہیے، اور کسی بھی وجہ سے اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ بابری مسجد کے معاملہ میں سیاسی مارچ کا طریقہ اختیار کرنا، یا یہ کہنا کہ اس کا تعلق شریعت سے نہیں ہے، سرکشی کی حد تک اسلام کے خلاف ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ٹھیک اسی نوعیت کا معاملہ (شدید تر شکل میں) پیش آچکا ہے تو مسلمانوں کے لیے کیوں کر جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں اسوۂ رسول کا لحاظ نہ کریں۔ وہ مکہ کی مسجد کے مماثل مسئلہ سے اجودھیا کی مسجد کے مسئلہ کے حل کے لیے نمونہ نہ پکڑیں۔

۷ ۔ حدیبیہ (۶ ھ) کے موقع پر بھی اسی سے ملتی جلتی صورت پیش آئی تھی۔ مسلمان عمرہ کے لیے مکہ میں داخل ہونا چاہتے تھے اور حرم مکہ کے قابض لوگ اس میں مزاحم ہو رہے تھے۔ اسی طرح آج مسلمان

اجودھیا کی مسجد میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور اس کے قابض لوگ نہایت شدت کے ساتھ مزاحمت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

حدیبیہ کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ ان کو حکم ملا کہ عمرہ ادا کیے بغیر مدینہ واپس چلے جاؤ۔ اس حکم کی مصلحت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ مسلمان اگر اقدام پر اصرار کرتے تو جنگ کی نوبت آتی اور اس میں بہت سے مسلمان ناحق مارے جاتے (الفتح ۲۴-۲۵) گویا اگر مسلمانوں کی جان کا خطرہ ہو تو حرم مکہ جیسی مقدس مسجد کی طرف "مارچ" کرنا بھی غیر مطلوب ہو جاتا ہے۔ مسلمان کی جان کی حفاظت ہر دوسری مصلحت پر مقدم ہے (ملاحظہ ہو الرسالہ اگست ۱۹۸۸، صفحہ ۱۴-۱۵)

اس مثال کی روشنی میں دیکھئے تو اجودھیا مارچ میں نہ صرف مسلمانوں کی ہلاکت کا اندیشہ ہے بلکہ اس میں پیش آنے والا جانی و مالی نقصان اس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو حدیبیہ کے وقت متوقع تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر پیش آنے والا نقصان تمام تر مقامی ہوتا۔ مگر آج جو حالات ہیں، ان کی روشنی میں یقینی ہے کہ اجودھیا مارچ کی صورت میں ہونے والا نقصان صرف اجودھیا تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ یقینی طور پر وہ پھیلے گا۔ اس کے نتیجہ میں پورے ملک کی فضا خراب ہوگی۔ جگہ جگہ فرقہ وارانہ فساد ہوں گے۔ اور حسب سابق مسلمان ہی ہر بار تباہی و بربادی کا نشانہ بنیں گے۔

اس عمومی بربادی میں مسلمانوں کے صرف ایک گروہ کا استثناء ہوگا۔ اور وہ ان بے ریش اور باریش رہنماؤں کا ہے جو مسلمانوں کو آگے کرکے خود ان سے الگ ہو جائیں گے۔ ان میں سے کوئی "جنرل" بن کر اپنے دفتر میں بیٹھ رہے گا، اور کوئی کسی بیرونی ملک کی کانفرنس میں شرکت کے لیے پرواز کر جائے گا۔ اس طرح سیاسی لیڈر اور ان کے حق میں اجازت نامہ جاری کرنے والے علماء یقینی طور پر محفوظ رہیں گے۔ مگر عام مسلمان اتنے سخت مصائب سے دوچار ہوں گے جن کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

۸۔ ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ اجودھیا مارچ اگرچہ بظاہر اجودھیا کی طرف ہوگا، مگر اس کا اصل نشانہ نئی دہلی ہے۔ یہ نماز کی ادائیگی کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اپنے دستوری حق کے استقرار کا مسئلہ ہے۔ بابری مسجد کی حیثیت محض علامت کی ہے۔ ورنہ اصل لڑائی اس بات کی ہے کہ دستور ہند میں جو مذہبی حقوق دیئے گئے ہیں، ان کو تسلیم کیا جائے اور حکومت اس بات کی ضامن بنے کہ دستور میں دیئے ہوئے کسی حق کو پامال نہیں کیا جائے گا۔

یہ مصلحت بھی ایک خود ساختہ مصلحت ہے جو سنتِ رسول سے واضح طور پر ٹکراتی ہے۔ یہاں میں دوبارہ حدیبیہ کی مثال دیتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذوالقعدہ ۶ ھ میں مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے تاکہ وہاں پہونچ کر کعبہ کی زیارت کریں اور عمرہ کے مراسم ادا کریں۔ آپ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہونچے تو اہلِ مکہ (قریش) نے روکا اور کہا کہ ہم آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ عمرہ کیے بغیر مدینہ واپس جائیں۔

قریش کا یہ فعل سراسر دستورِ عرب کے خلاف تھا۔ عرب میں یہ مسلّمہ دستور تھا کہ کوئی شخص کعبہ کی زیارت کے لیے آئے تو اس کو روکا نہ جائے۔ چنانچہ ساری قدیم تاریخ میں کبھی کسی کو زیارت کعبہ سے روکا نہیں گیا تھا۔ یہ دستوری حق اتنا زیادہ قطعی اور مسلّم تھا کہ جب سردارانِ قریش نے آپ کو روکا تو خود مشرکوں میں کچھ ایسے لوگ نکلے جنھوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ مثلاً حُلَیس بن علقمہ (سیدالاحابیش) جو قریش کا حلیف تھا، اس نے غصہ ہو کر کہا:

یامعشرَ قریش واللہ ما علیٰ ھذا حالفْناکم ولا علیٰ ھذا عاھدناکم۔ اَیُصَدُّ عن بیت اللہ مَن جاءہ معظمًا لہ۔ والذی نفسُ الحُلیس بیدہ لتُخَلُّنّ بین محمد وبین ما جاء لہ اولَاَنفِرنّ بالاحابیش نفرۃَ رجل واحدٍ۔

(سیرۃ ابن کثیر، المجلد الثالث، صفحہ ۳۱۶)

اے قریش کے لوگو، خدا کی قسم، ہم اس بات پر تمہارے حلیف نہیں بنے تھے اور نہ اس بات پر ہم نے تم سے معاہدہ کیا تھا۔ کیا اُس شخص کو بیت اللہ سے روکا جانے لگا جو بیت اللہ کی زیارت کے لیے اور اس کی تعظیم کے لیے آیا ہو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں حُلیس کی جان ہے، تمہیں محمد اور وہ جس کام کے لیے آئے ہیں، اس کے درمیان سے ہٹنا ہوگا، ورنہ میں تمام حبشیوں کو لے کر یک لخت تم سے الگ ہو جاؤں گا۔

اس قسم کی بات کچھ اور مشرکوں نے بھی کہی۔ مگر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اپنے "دستوری حق" کا سوال نہیں اٹھایا۔ اور نہ یہ کہہ کر اس کو اہم بنانے کی کوشش کی کہ یہ ایک علامتی واقعہ ہے، ہم کو "گربہ کشتن روز اول" کے اصول پر عمل کرنا چاہیے۔ ورنہ آج عمرہ کے بارہ میں ہمارا دستوری حق ہمیں دینے سے انکار کیا جارہا ہے۔ کل ہم کو حج کے حق سے محروم کیا جائے گا۔ اور پھر حقوق

میں دراندازی کی فہرست معلوم نہیں کہاں کہاں تک جا پہونچے گی۔

موجودہ نام نہاد مسلم لیڈروں کی طرح، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا کہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر اکسائیں کہ دیکھو، یہ صرف ایک عمرہ کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک دستوری حق کا معاملہ ہے۔ ہمیں بہرحال دستوری حق کی لڑائی لڑنی ہے، اور اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹنا ہے جب تک ہم اپنے دستوری حق کو پوری طرح منوانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے "غیر دستوری" مطالبہ کو مان لیا اور عمرہ کیے بغیر حدیبیہ سے واپس چلے آئے۔

قرنِ اوّل کی یہ مثال بتاتی ہے کہ "دستوری حق" اور "علامتی واقعہ" وغیرہ اہلِ باطل کی بولیاں ہیں، وہ پیغمبر کی بولی نہیں ہے۔ جو لوگ اس قسم کے الفاظ بول رہے ہیں وہ پیغمبر کے نمونہ پر نہیں چل رہے ہیں، بلکہ باطل پرست قوموں کے نمونہ پر چل رہے ہیں۔ پیغمبر کا طریقہ "دستوری لڑائی" لڑنا نہیں ہے، بلکہ حقیقتِ واقعہ کو بدلنا ہے۔ پیغمبر کا طریقہ دل کو جیتنا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کو جیتنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ کو اہلِ شرک کے حوالے کر دیا، اور خود اپنی ساری کوشش انسانوں کو بدلنے پر لگا دی۔ آخر کار جب انسان بدلے تو انسان بھی آپ کے قبضہ میں آگیے اور الفاظ بھی۔

۹۔ جو لیڈر صاحبان اجودھیا مارچ کے حامی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم اس وقت مارچ کی کارروائی نہ کریں اور اجودھیا کی مسجد کے معاملہ میں خاموش ہو جائیں تو غاصب گروہ کے حوصلے مزید بڑھ جائیں گے۔ آج انھوں نے ایک مسجد پر قبضہ کیا ہے، کل وہ دوسری مسجدوں پر قبضہ کریں گے۔

یہ بالکل بے وزن بات ہے اور محض اپنی بدترین نالائقی پر پردہ ڈالنے کے لیے گھڑی گئی ہے۔ راقم الحروف نے الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ (قیادت کا دیوالیہ پن) میں دکھایا ہے کہ اسی ملک میں دوسری بہت سی مسجدیں جو ۱۹۴۷ کے ہنگامے میں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ آج وہ مکمل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔

مساجد کی بازیابی کے معاملہ میں یہ کامیابی تمام تر خاموش حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ حاصل کی گئی۔ اگر کوئی صاحب اس معاملہ میں براہِ راست واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہوں تو دہلی کی حد تک ــــ، میں ذاتی ذمہ داری لیتا ہوں۔ وہ میرے پاس آئیں اور میں ان کو لے جا کر دہلی کی کئی بڑی بڑی مسجدیں دکھاؤں گا۔ کچھ سال پہلے تک یہ مسجدیں اغیار کے قبضہ میں تھیں۔ آج وہ پوری طرح مسلمانوں کے پاس ہیں۔ وہاں

باقاعدہ دینی مدرسے قائم ہیں۔ اور پنج وقتہ نمازیں جماعت کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ یہ اعلیٰ کامیابیاں صرف اس لیے ممکن ہوئیں کہ اس جدوجہد میں پیشہ ور لیڈروں میں سے کسی لیڈر کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔

سیاسی اشو بنانے اور قومی پرسٹیج کی حیثیت دینے سے پہلے خود بابری مسجد کے معاملہ میں بھی اس خاموش اور حکیمانہ حل کا امکان پوری طرح موجود تھا۔ اس کی ایک مثال ۲۷ مارچ ۱۹۸۷ کی وہ مشترکہ میٹنگ ہے جس کی روداد الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ صرف نام نہاد مسلم لیڈر ہیں جنھوں نے بابری مسجد کو قیادتی استحصال کا ذریعہ بنا کر اس قیمتی امکان کو برباد کیا۔ بابری مسجد کے معاملہ کو بگاڑنے کے اصل ذمہ دار مسلمان لیڈر ہیں۔ اگرچہ انھوں نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کا رُخ دوسروں کی طرف موڑ دیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ابتدا میں ہندوؤں کی بیشتر تعداد اس معاملہ میں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر مسلمانوں کی حامی تھی۔ تھوڑے سے کٹر ہندوؤں کے سوا کسی کو اس سے دل چسپی نہ تھی۔ اس کا ایک ثبوت ہندو اہلِ علم کے وہ منصفانہ مضامین ہیں جو ملک کے اخبارات و رسائل میں کثرت سے شائع ہو رہے تھے (ملاحظہ ہو الرسالہ، دسمبر ۱۹۸۶، صفحہ ۱۷-۲۲)

نئی دہلی میں بابری مسجد ریلی (۳۰ مارچ ۱۹۸۶) کے بعد یہ فضا بدلنا شروع ہوئی۔ مسلم لیڈروں کی احمقانہ سیاست بازی معاملہ کو بگاڑتی چلی گئی۔ پہلے یہ مسئلہ سادہ طور پر معقولیت اور غیر معقولیت کے درمیان کا مسئلہ تھا۔ مگر بعد کو بڑھتے بڑھتے وہ ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کا مسئلہ بن گیا۔ اس نے دونوں گروہوں کے لیے فرقہ وارانہ عصبیت یا قومی ساکھ (Prestige) کی صورت اختیار کر لی۔ اس نوبت کو پہونچنے کے بعد مسلمان اس معاملہ میں اکیلے ہو گیے۔ انھوں نے ہندوؤں کی وہ حمایت کھو دی جو ابتدا میں انھیں وسیع پیمانہ پر حاصل تھی (ملاحظہ ہو الرسالہ جولائی ۱۹۸۵، صفحہ ۳۱-۳۲)

بابری مسجد کا مسئلہ اپنی ابتدائی صورت میں ایک محدود مقامی مسئلہ تھا۔ مگر مسلمانوں کے سطحی لیڈروں نے اپنی ناقابلِ بیان نادانیوں کے ذریعہ انتہائی غلط طور پر اس کو ایک ملکی اور قومی مسئلہ بنا دیا۔ جب کوئی مسئلہ اس نوبت تک پہونچ جائے تو اس وقت معقولیت پس پشت چلی جاتی ہے۔ اور صرف گروہی عصبیت ہی قوموں کی رہنما کی حیثیت سے باقی رہتی ہے۔ ایسے وقت میں قوم کے کسی فرد کا

حق بات کہنا اپنے کو اپنی قوم کے اندر نکّو بنانے کی قیمت پر ہوتا ہے ، اور کون ہے جو نکّو بننے کی قیمت پر حق بات کا اعلان کرے۔ ایسا حق پرست تو خود مسلمانوں میں بھی کوئی نہیں ، پھر ہندوؤں کے بارہ میں ہم کیسے امید کر سکتے ہیں کہ ان میں ایسے حق پرست جھنڈ کے جھنڈ موجود ہوں گے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ صحافتی تاجروں اور سیاسی استحصال پسندوں کی شکارگاہ بنے ہوئے ہیں۔ آج مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انھیں اس دلدل سے نکالا جائے۔

۱۰۔ تاہم ان چیزوں سے قطع نظر، بنیادی بات یہ ہے کہ مذکورہ قسم کے تمام اندیشے ایمانی تقاضے کے سراسر خلاف ہیں۔ کیوں کہ کسی معاملہ میں جب خدا ورسول کا فیصلہ معلوم ہو جائے تو وہی خیر اور مصلحت کی بات ہے۔ اس کے بعد عقلی نکتے نکالنا اور کسی دوسری چیز کو ملی مصلحت بتانا مجرمانہ سرکشی کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ : کسی مومن مرد یا کسی مومن عورت کے لیے گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کے لیے اس میں اختیار باقی رہے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا (الاحزاب ۳۶)

مسلمان اگر خدا و رسول پر ایمان رکھتے ہیں تو انھیں خدا و رسول کی رہنمائی کو بے چون و چرا مان لینا ہوگا۔ ان کے لیے فلاح و سعادت کا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔ خدا ورسول نے جس مصلحت کا لحاظ کیا ہو، وہی صحیح اور معتبر مصلحت ہے۔ دوسری کوئی مصلحت صحیح اور معتبر مصلحت نہیں ، خواہ بظاہر وہ ہم کو کتنی ہی زیادہ اہم دکھائی دیتی ہو۔ اس سلسلہ میں محدث کبیر حضرت امام مالک کا یہ قول یاد دلانا کافی ہوگا : لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا (اس امت کا آخر بھی صرف اسی سے درست ہوگا جس سے اس کا اول درست ہوا)

اوپر جو باتیں عرض کی گئیں ، وہ دو اور دو چار کی طرح یہ ثابت کرتی ہیں کہ اجودھیا مارچ یا بابری مسجد تحریک بلاشبہ ان مسائل میں سے ہے جن کا تعلق شریعت سے ہے ، اور مسلمانوں کو اس معاملہ میں لازمی طور پر شریعت کی رہنمائی میں عمل کرنا چاہیے ، اس سے آزاد ہو کر نہیں۔ اگر انھوں نے اس معاملہ میں آزادانہ عمل کیا تو یقیناً وہ اس کے لیے خدا کے نزدیک مجرم قرار پائیں گے۔ کسی بزرگ کو یہ حق نہیں کہ وہ اس معاملہ کو غیر شرعی معاملہ قرار دے ، اور نہ کسی بزرگ کا دیا ہوا سرٹیفکٹ اس معاملہ میں انھیں خدا کی پکڑ سے بچانے والا ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۱۔ مسلم لیڈروں کی لفظی ہنگامہ آرائی سے بابری مسجد اشو میں تو کسی قسم کی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ البتہ ہندو فرقہ پرست عناصر کو ضرور نئی زندگی مل گئی ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ بدنام ہندو مورخ مسٹر پی این اوک نے دوبارہ نئے نئے انکشافات شروع کر دیئے ہیں۔ ان کا ایک انکشاف یہ اخبارات میں آیا ہے کہ دہلی کی جامع مسجد ایک مندر کی جگہ پر بنی ہے۔ قدیم زمانہ میں یہاں ایک ہندو مندر تھا۔ مغل دور میں اس کو ڈھاکر وہاں مسجد بنائی گئی (ٹائمس آف انڈیا ۵ اگست ۱۹۸۸) علی گڑھ میں ہندو تنظیموں کی میٹنگ میں اعلان کیا گیا کہ مسلمان اگر ۱۲ اگست کو اجودھیا مارچ کرتے ہیں تو اسی دن ہندوؤں کا جتھا مسجد میں ہنومان چالیسا کا پاٹھ کرنے کے لیے داخل ہوگا۔ اور یہ کہ "۱۲ اگست وہ تاریخی دن ہوگا جب یہ بات صاف ہو جائے گی کہ بھارت میں مسلمانوں کو کن حالات میں رہنا ہے۔" (پرتاپ ۱۲ اگست ۱۹۸۸)

اس طرح کی باتوں کی بنا پر ممکن ہے کہ ہمارے لیڈر صاحبان کوئی خوبصورت عذر نکال کر مارچ کو ملتوی کر دیں جس کا اندیشہ الرسالہ جولائی ۱۹۸۸ میں ظاہر کیا گیا تھا۔ تاہم اس غلط سیاست کے ذریعہ مسلمانوں کو تباہی کے جس کنارہ پر کھڑا کر دیا گیا ہے، اس کے نقصان کا سلسلہ مارچ کے التوا کے بعد بھی ختم نہ ہوگا۔

اس معاملہ میں مسلمان لیڈر جس طرح چیلنج کی زبان میں بات کرتے رہے ہیں، جس طرح انھوں نے مسلمانوں سے "بابری مسجد لے کے رہیں گے" کے نعرے لگوائے ہیں، اپنی پرجوش تقریروں سے جس طرح انھوں نے مسلمانوں کے جوش کو آخری حد تک ابھار دیا ہے، اس کے بعد مارچ کو روکنا کوئی سادہ واقعہ نہیں ہوگا۔ یہ مسلمانوں کو بہت بڑے پیمانہ پر اس احساس سے دوچار کرنے ہم معنی ہوگا کہ ہمارے لیے کچھ کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ کسی گروہ کو ایک ایسے نشانہ کے لیے ابھارنا جو پورا ہونے والا نہ ہو، نتیجہ کے اعتبار سے انھیں مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس میں مبتلا کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقدام وہی ہے جو سچا اقدام ہو، جھوٹا اقدام بربادی کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔ تکمیل مقصد کے بغیر مارچ کا فیصلہ واپس لینے کے بعد یہی واقعہ اپنی شدید ترین صورت میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آئے گا۔

یہی وہ المناک اندیشہ تھا جس کے بارہ میں الرسالہ ستمبر ۱۹۸۶ کے صفحہ اول پر ان الفاظ میں چیتاؤنی دی گئی تھی: بزدلی دکھا کر چپ ہونے سے بہتر یہ ہے کہ آدمی بزدلی دکھائے بغیر چپ ہو جائے۔

ایک انتباہ

بیسویں صدی میں مسلمانوں نے بار بار ایسا کیا ہے کہ وہ سیاسی لیڈروں کو اپنے ملی معاملات میں رہنما بنا لیتے ہیں۔ یہ مزاج اب اتنا زیادہ بڑھ چکا ہے کہ مسجد اور نماز جیسے امور میں بھی سیاسی لیڈر ہی ان کے رہنما اور نمائندے بنے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ فعل ان کے تمام جرموں میں سب سے زیادہ سنگین جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے اس مزاج کو لازمی طور پر انھیں بدلنا ہوگا ورنہ شدید اندیشہ ہے کہ وہ خدا کی نصرت سے محروم ہو جائیں، اور پھر اس دنیا میں کوئی ان کا حامی و مددگار نہ رہے۔

ایک تاجر کو اپنی دکان کے لیے سیل مین کا انتخاب کرنا ہو تو وہ کبھی کسی داداکو اپنی دکان کا سیل مین نہیں بنائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کامیاب سیل مین میں جو سب سے ضروری صفت درکار ہے وہ میٹھا بول ہے، جب کہ داداگیری کے پیشہ میں، اس کے برعکس، کڑوا بول سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ دادا کڑوے بول کا ماہر ہوتا ہے، اس لیے وہ ایسے منصب کے لیے قطعاً موزوں نہیں جہاں میٹھا بول سب سے زیادہ مطلوب خصوصیت کی حیثیت رکھتا ہو۔

مسلمان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک داعی گروہ ہیں۔ ان پر لازم ہے کہ ان کی تمام سرگرمیاں دعوت رخی (Dawah oriented) ہوں۔ وہ ہر دوسری مصلحت پر دعوت کی مصلحت کو غالب رکھیں۔ سیاسی لیڈر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کا پورا فکر سیاست رُخی (Politics oriented) ہوتا ہے۔ وہ سیاسی مصلحت کو ہر دوسری مصلحت پر غالب رکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان جیسے گروہ کی نمائندگی کے لیے سیاسی لیڈر کسی طرح بھی موزوں اور مناسب نہیں۔

داعی اور لیڈر دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف شخصیتیں ہیں۔ داعی ایجابی نفسیات کی پیداوار ہے اور لیڈر ردعمل کی نفسیات کی پیداوار۔ داعی محبت کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے اور لیڈر نفرت کی زمین پر۔ داعی دوسروں کو اپنے مطلوب کی نظر سے دیکھتا ہے اور لیڈر دوسروں کو اپنے حریف کی نظر سے۔ داعی کا مفاد دوسروں کے ساتھ مصالحت میں ہوتا ہے اور لیڈر کا مفاد دوسروں کے ساتھ ٹکراؤ میں۔ داعی حقائق کو مرکزِ توجہ بناتا ہے اور لیڈر شوشوں کے پیچھے دوڑتا ہے۔ داعی خدا کی مرضی پر چلتا ہے اور لیڈر عوامی خواہشات پر۔ داعی کا مقصد لوگوں کا دل جیتنا ہے اور لیڈر کا مقصد لوگوں کا استحصال کرنا۔ داعی کی نظر اصل کام پر ہوتی ہے اور لیڈر کی نظر شہرت اور مقبولیت پر۔ خلاصہ یہ

کہ داعی اصلاح کا نقیب ہوتا ہے اور لیڈر تخریب کا علم بردار۔

داعی اور لیڈر کا یہ فرق لیڈر کو امت مسلمہ جیسے گروہ کی نمائندگی کے لیے اسی طرح غیر موزوں بنا دیتا ہے جس طرح کسی دادا کی دادا گیری اس کو دکان کی سیلس مین شپ کے لیے غیر موزوں بنا دیتی ہے۔ مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ اس ملک میں ان کے لیے مواقع کار کھلیں اور وہ خدا کی رحمت میں اپنا حصہ پائیں تو سب سے پہلا کام انھیں یہ کرنا ہے کہ وہ سیاسی لیڈروں کو اپنے ملی معاملات سے نکال پھینکیں۔ اس کے بغیر ان کے معاملات کبھی درست ہونے والے نہیں۔

اگر مسلمانوں کو آج یہ حقیقت دکھائی نہیں دیتی تو وہ دن دور نہیں جب پردہ پھٹے اور تمام حقیقتیں اپنے برہنہ روپ میں سامنے آجائیں۔ اس وقت ہر آدمی سچائی کو ماننے پر مجبور ہوگا، اگرچہ اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا۔

ISLAMIC LITERATURE
In the Contemporary Idiom

By Maulana Wahiduddin Khan

God Arises
Pages 265 Price Rs 45

Muhammad
The Prophet of Revolution
Pages 220 Price Rs 50

Muhammad
The Ideal Character
Pages 20 Price Rs 4

Man! Know Thyself
Pages 20 Price Rs 4

Religion and Science
Pages 96 Price Rs 25

The Way to Find God
Pages 24 Price Rs 4

The Teachings of Islam
Pages 24 Price Rs 5

The Good Life
Pages 40 Price Rs 5

The Garden of Paradise
Pages 44 Price Rs 5

The Fire of Hell
Pages 44 price Rs 5

Tabligh Movement
Pages 68 Rs 20

Forthcoming Publications:

Women In Islam

Islam As It Is

Islam: The Voice of Human Nature

God-Oriented Life

خبرنامہ اسلامی مرکز ۴۳

۱۔ انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۲ جولائی ۱۹۸۸) نے صدر اسلامی مرکز کا ایک مفصل مضمون شائع کیا ہے۔ اس کا عنوان حسب ذیل ہے :

American Asians: A Model

اس مضمون میں مشن کے تعمیری نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ انشاء اللہ اسلامی مرکز کا تعمیری پیغام وسیع تر حلقہ تک پہونچانے میں مدد ملے گی۔

۲۔ پروفیسر موتی لال جوتوانی (نئی دہلی) نے گاڈ ارائزز کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اس کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط (۲۰ مئی ۱۹۸۸) لکھا ہے۔ اس کی چند سطریں یہ ہیں :

After reading the book, I wasn't the same as before: it made a thought-provoking perusal. No doubt, it is a good addition to Islamics. (Dr. Motilal Jotwani).

۳۔ حسین امام انجینیر نے جاپان سے اپنے خط (۲۳ مئی ۱۹۸۸) میں لکھا ہے کہ ان کو اسلامی مرکز کی کتاب "اللہ اکبر" ملی۔ انھوں نے اس کا مطالعہ کیا اور اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کتاب کو بہت جلد انگریزی زبان میں شائع کیا جائے۔ جدید انسان کو اسلام کا ربانی پیغام پہونچانے کے لیے یہ کتاب بے حد موزوں ہے۔

۴۔ صدر اسلامی مرکز کے سفر نامے مرتب کیے جا رہے ہیں۔ انشاء اللہ وہ حسب ذیل ترتیب سے شائع ہوں گے :

میوات کا سفر
غیر ملکی اسفار
ملکی اسفار (مطبوعہ الرسالہ)
بقیہ اسفار (مطبوعہ الجمعیۃ ویکلی)

۵۔ عرب ملکوں سے اکثر خطوط آتے رہتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ نہایت دل چسپی کے ساتھ مرکز کی عربی اور انگریزی مطبوعات کو پڑھ رہے ہیں اور اس سے گہرا

تاثر قبول کررہے ہیں۔ الجزائر سے استاذ محبوب میلود اپنے خط (۲۳ شعبان ۱۴۰۸) میں اپنے مطالعہ کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں : وقد قرأت فی رسائلکم وکتبکم عن اهداف المرکز فانها والحق تعالیٰ اعجبنی واثلجت صدری۔

۶۔ ایک صاحب اپنے خط (۲۶ مئی ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں : ایک مقام پر کچھ خواتین نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ اسلام نے ہم کو بہت پیچھے کر دیا ہے۔ بیرونی کاموں سے ہم کو معطل رکھا جاتا ہے۔ جب کہ دوسری عورتیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ میں نے ان کو الرسالہ اکتوبر ۱۹۸۷ کا مضمون "تہذیب جدید کے مسائل" پیش کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے جادو کا اثر کیا۔ پھر میرے پاس جتنے رسالے تھے سب لے جاکر دیا تو ایک ہی دن میں سب پڑھ ڈالا۔ اب ان لوگوں کو الرسالہ سے بے حد دلچسپی ہوگئی ہے (جنید احمد، سیوان)

۷۔ غالب اکیڈمی کی تقریر (۱۷ اپریل) کی رپورٹ دہلی کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئی۔ ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمس (۱۸ اپریل ۱۹۸۸) نے تقریر کا خلاصہ دیتے ہوئے اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا : اسلام درمیان یگ کا زمانا۔ اخبار ہجوم نے اپنی تفصیلی رپورٹ اس عنوان کے ساتھ شائع کی "اسلام دور جدید کا خالق"۔ وغیرہ

۸۔ بعض مقامات سے اطلاع ملی ہے کہ وہاں الرسالہ کے قارئین اور اس کے ہمدرد ہفتہ میں ایک بار کسی مقام پر جمع ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنا کھانا اپنے ساتھ لاتا ہے، اور سب مل کر ایک ساتھ کھاتے ہیں اور پھر الرسالہ کی توسیع و ترقی کے لیے مشورہ کرتے ہیں۔ "اجتماعی کھانا" کا یہ طریقہ بہت مناسب ہے۔ دوسرے مقامات کے احباب کو بھی اس پر عمل کرنا چاہیے۔

۹۔ مرکز کی اشاعتی اسکیم کے تحت حسب ذیل نئی کتابیں زیر طبع ہیں : میوات کا سفر، تعمیر کی طرف، کاروانِ اسلام، نشری تقریریں، پیغام عمل، عقلیات اسلام۔

۱۰۔ ریاض سے ایک صاحب اپنے خط ۲۵ اپریل ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں : کئی سالوں سے الرسالہ پڑھ رہا ہوں۔ یہ رسالہ ہمارے لیے بہترین نسخہ ہے۔ الرسالہ ہمارے ایک انڈین مسلمان کی معرفت ملتا ہے۔ اس سے مجھے بہت فائدہ پہونچا۔ اس سے پہلے میں حق کی پگڈنڈی پر

چل رہا تھا، اب میں حق کی شاہراہ پر چلتے ہوئے مومن کی کیفیت اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ اس رسالہ کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب ہم اسلام میں صحیح طور پر داخل ہوئے ہیں اور اب ایمان لائے ہیں۔ مجھے اسلامی لٹریچر میں اس سے معیاری اور کوئی رسالہ اب تک نظر نہ آیا۔ الرسالہ کے مختصر مضامین نے مجھے سوچ سمجھ عطا کی اور میری زندگی کو پورے طور پر تعمیری کاموں کے لیے بنا دیا۔ (محمد منیر فیض)

۱۱۔ ایک صاحب اپنے خط (۲ جون ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں: ہمارے آفس میں ایک انجینیر ہیں ان کا نام جینت بابو راؤ شمتی ہے۔ وہ خدا پر یقین نہیں کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو کچھ ہے انسان ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ ان سے بات ہوئی تو میں نے ان کو گاڈ ارائز پڑھنے کے لیے دی۔ تیسرے دن انھوں نے آفس آتے ہی مجھ سے ملاقات کی اور کہا۔ میں نے کتاب کا مطالعہ کیا۔ یقیناً تم نے ایک بہت ہی قیمتی کتاب مجھے پڑھنے کے لیے دی ہے۔ انسان کچھ نہیں۔ اس کتاب میں بہت ہی مدلل مقالے ہیں۔ اب مجھے اپنے نظریہ پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ آپ سے خط کتابت کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی گاڈ ارائز کا ترجمہ مراٹھی زبان میں کرنا چاہتے ہیں۔

۱۲۔ ایک صاحب کراچی سے اپنے خط (۱۵ مئی ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں: آپ کی کتابوں کی افادیت محسوس کر کے ہم نے انھیں سندھی زبان میں شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تک آٹھ دس کتابوں کے متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور سندھی نوجوانوں کے یہ تاثرات آئے ہیں کہ خدا کے فضل سے ان کتابوں کے مطالعہ نے ہمیں الحاد و دہریت کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچا لیا۔ (محمد موسیٰ بھٹو، حیدر آباد، سندھ)

۱۳۔ ایک صاحب اپنے خط ۱۱ جون ۱۹۸۸ میں لکھتے ہیں: میں ایک مصروف دکاندار ہوں۔ اس وجہ سے کتابوں کا مطالعہ نہیں کر پاتا۔ مگر اس کے باوجود الرسالہ کا مطالعہ باقاعدگی کے ساتھ کرتا ہوں۔ دکان پر جب بھی کچھ موقع ملتا ہے، الرسالہ کھول کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ہر روز رات کو سونے سے پہلے گھر کے تمام افراد کو الرسالہ کے مضامین سناتا ہوں۔ الحمد للہ آپ کے مضامین کو سن کر ہمارے بچوں کا مزاج اتنا بدل گیا ہے کہ وہ دینداری کی طرف مائل ہو گیے ہیں (انور کمال، کلکتہ)

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 September 1988 No 142

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملّت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملّت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Rs. 4